

UNIVERSAL
LIBRARY

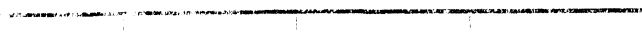
OU_222036

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

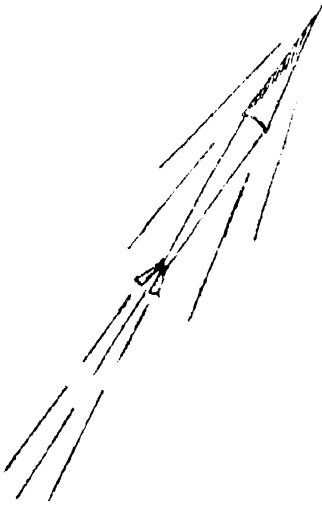
Class No. AT/2158 Accession No. 17754
Author C. S. ... 14600
Title ...

This book should be returned on or before the date last marked below.



1975

منجی سیر



شوکت تھانوی

حقوق اشاعت بنام مکتبہ کلیاں، لکھنؤ
محفوظ ہیں

۱۷۷۵۴

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

پرنٹس
سرفراز
قومی پریس
لکھنؤ

ناشر
مکتبہ
کلیاں
لکھنؤ

ٹیلیفون ۵۷۲۵

مریخ کی سیر

آج ۱۷ دسمبر ۱۹۵۷ء کو، ۲۰-۵۷ء سمجھ کر میری آج کی ڈائری پڑھو کہ صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ مریخ یونیورسٹی سے میرے دونوں بچے چھٹیاں منانے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے فوراً ان دونوں کو بلایا۔ ان کے ساتھ ایک مریخی دوست بھی آیا ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ لڑکا خالص مریخی باشندہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا تمام جسم مچھلی کی طرح کا تھا۔ اور سر بھی اس دنیا کے باشندوں سے الگ بندر اور تلی کی درمیانی وضع کا تھا۔ میرے بچے آتے ہی مجھ سے لپٹ گئے۔ اور اس مریخی لڑکے نے مجھ کو نہایت ادب کے ساتھ مریخ کے قاعدے سے اپنی دم بٹا کر سلام کیا۔ میرے بچے اپنے اس دوست کا تعارف مجھ سے کرنا ہی چاہتے تھے کہ میں نے خود مریختانی زبان میں اس سے اس کا نام پوچھا اور اس نے نہایت سلیس دنیاوی زبان میں اپنا نام ”ترنگول“ بتایا جس کے معنی مریختانی زبان میں شہرت کے ہوتے ہیں۔ میرے لڑکے نے اپنے اس دوست کی مزید تعریف کرتے ہوئے کہا۔ یہ یونیورسٹی میں ہم دونوں بھائیوں کے تہذیب دوست ہیں اور ہم تینوں ایک ہی کمرے میں

مریج کی سیر

رہتے ہیں۔ ان کے والد مریج کے ملک ”سششاش“ کے شہر ”دغدغہ“ میں راکٹ بنانے کا کارخانہ کھولے ہوئے ہیں اور اس مرتبہ ہم لوگ اسی کارخانہ کے راکٹ یہاں تک آئے ہیں۔

میں نے نہایت دلچسپی سے یہ حالات سنے اور اپنے بچوں سے کہا۔ کہ کڑنگول سلہ کو اپنی امی سے بلاؤ غالباً وہ آگئی ہوں گی۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ آج خلافت معمول اب تک واپس نہیں آئی ہیں۔ حالانکہ جب سے ڈاکٹر نے سمندر سی آب و ہوا میں رات بسر کرنے کی ان کو ہدایت کی ہے۔ ان کا معمول یہی رہتا ہے کہ وہ رات کو کھانا کھا کر آٹھ بجے لکھنؤ سے چل کر نو بجے بمبئی پہنچ جاتی ہیں۔ اور تمام رات ساحل پر گزار کر صبح کی چائے پھر لکھنؤ ہی میں پتی ہیں۔ مگر آج چائے کے وقت پر موجود نہیں۔ لہذا مجھ کو قدرتی طور پر فکر تھی۔ کہ آخر قصہ کیا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میں ان کے متعلق پوچھ گچھ شروع کروں، بیسی کو اپنی سناہٹ سنائی دی اور فوراً ہی وہ مسکراتی ہوئی کمرہ میں داخل ہو گئیں۔ دونوں بچے دوڑ کر ان سے لپٹ گئے اور مریجی لڑکے نے نہایت تعظیم سے دم ہلا کر ان کو سلام کیا۔ میں نے دیر میں آنے کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ چند منٹ کے لئے بھوپال میں اتر گئی تھیں۔ بہر حال میں نے بٹن دبا کر اپنی مسہری کو مینہ کی صورت میں منتقل کر دیا۔ اور گرم شاعیں پھینکنے والی ٹارچ دکھا کر ٹھنڈے پانی کو فوراً اُبال دیا۔ میں تو اس وقت چائے کے ساتھ صرف دو بسکٹ کھاتا ہوں۔ مگر بچوں کو ذرا اچھے ناشتے کی ضرورت تھی۔ لہذا میں نے ایک شیشی سے دو دو گویاں نکال کر دونوں بچوں کو اور ان کے مریجی دوست کو

مریخ کی سیر

دے دیں۔ چنانچہ بچوں نے گولیوں کو اپنی اپنی پلیٹ میں رکھ کر حبیبی ہی پانی کا چھینٹا دیا وہ پھول کر دو خوبصورت اور مزیدار کیک بن گئیں۔ مگر اس وقت ایک مصیبت یہ تھی کہ آدمی تھے پانچ اور میرے یہاں جو مرغی تھی۔ وہ میری ضرورت کے مطابق صبح کے وقت چار ہی انڈے دیتی تھی۔ دو میں کھاتا تھا اور دو بیگم۔ لیکن جب بچے آجاتے تھے تو سب ایک ایک۔ مگر آج ان چار کو پانچ بنانا کیونکر ممکن تھا۔ میں اسی فکر میں تھا کہ بیگم نے مسکرا کر کہا کہ آپ انڈوں کے متعلق فکر نہ کریں۔ میں بھوپال سے ناشتہ کر کے آئی ہوں۔ البتہ کل کے لئے یہ انتظام کرنا ہوگا کہ مرغی کو پانچ انڈے دینے والی دو آج ہی رات کو پلا دی جائے۔ بہر حال اس وقت انڈوں کا مسئلہ حل ہو گیا اور کوئی بے لطفی پیدا نہ ہو سکی۔ ہم لوگ ابھی چائے سے اٹھے ہی تھے کہ گھنٹی بجی۔ اور اب جو میں آئینہ دیکھتا ہوں تو میرے ایک کناٹا کے دوست کا چہرہ نظر آیا۔ میں نے فوراً ایک بٹن دبا دیا جس سے ڈرائنگ روم خود بخود کھل جاتا ہے۔ دراصل یہ آئینہ جس میں میرے دوست کا چہرہ نظر آیا تھا بڑی عمدہ چیز ہے۔ اس کے ساتھ کا ایک آئینہ باہر لگا ہوا ہے۔ چنانچہ جو کوئی بھی اس آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اس کا عکس اس کے اندر وائے آئینہ میں فوراً آجاتا ہے۔ اور گھنٹی بجتی ہے۔ اس طرح نہ کسی کو آواز دینے کی ضرورت نہ وزٹینگ کارڈ بھینچنے کی ضرورت۔ بہر حال ان دوست کے آنے کی اطلاع پا کر میں نے فوراً بجلی کا پلٹ اپنے پھرے پر پھیرا جس سے ایک سکنڈ میں وار بھی بن جاتی ہے۔ اس کے بعد میں اس الماری میں گھس گیا

مرنج کی میر

جو ڈیڑھ منٹ میں کپڑے پہنا دیتی ہے۔ آخر کار میں نے وہ ٹوپی پہن لی جو اوپر سے ٹوپی ہے اور اندر ہی اندر بالوں میں کنگھی کرتی رہتی ہے تاکہ جب ٹوپی اتاری جائے تو بال بے ہوئے نکلیں۔ بہر حال میں فوراً ڈرائنگ روم میں پہنچا اور اپنے دوست سے ملا۔ وہ آج ہی فضائی بائیسکل پر کناڈا سے آئے تھے اور شام تک واپسی کا ارادہ تھا۔ ان کے آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ریڈیو پر انھوں نے جو تقریر کی تھی اسی کو خود سننے ہندوستان میں ان کی آواز کیسی آئی۔ میں نے ان سے کہا کہ پہلے اس کو مذاق سمجھا جاتا تھا کہ ایک آدمی خود اپنی آواز کسی دوسری جگہ سے سُنے۔ مگر آج سائنس کی ترقی نے اسی مذاق کو واقعہ بنا دیا ہے۔ میرے دوست ہنسنے لگے۔ اور لا پرواہی سے کہا: ”جی ہاں وہ جمالت کا زمانہ تھا۔ اس وقت یہ معمولی سی بات کس کی سمجھ میں آتی تھی کہ دن میں دو تین مرتبہ ایک شخص کناڈا سے ہندوستان تک آ جا سکتا ہے۔ لوگ ایونیوں کی طرح اونگھ اونگھ کر ہینوں میں یہ سفر طے کرتے تھے۔ گویا یہ سفر زہرہ اور مشتری کا سفر تھا۔ موٹر ایسی سست رفتار سواری پر اس زمانہ کو ناز تھا۔ اور ہوائی جہاز گویا مچھرہ کا درجہ رکھتے تھے۔ میں نے ان کو دن کے کھلنے کی دعوت دی۔ مگر ان کو عذر یہ تھا کہ دن کا کھانا مہراں کے ایک دوست کے ساتھ کھانا ہے۔ اور رات کو کراچی میں نہ رہے۔ میں بھی اس سلسلہ میں اصرار نہ کر سکا۔ اور چند منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد مجھ کو بھی دفتر جانا تھا۔ لہذا میں نے فوراً اپنے بازوؤں میں پر لگائے اور

مسیخ کی میر

تیسری منزل پر پہنچ کر دفتر کی جانب اڑ گیا۔ مجھ کو ان پروں سے بڑا آرام ملتا ہے۔ اور بہت جلد دور دراز راستے طے ہو جاتا ہے۔ تاریخی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح آجکل غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ یہ پر رکھتے ہیں اسی طرح اگلے زمانے میں لوگ یہ گاڑی رکھا کرتے تھے جس کو سائیکل کہتے تھے۔ اور اس پر بیٹھ کر عام انسانی رفتار سے ذرا تیز رو ہو کر اپنا راستہ طے کیا کرتے تھے۔ عجیب نہ مانو۔ تصاویر بھی جب زمین اس قدر فالتو تھی کہ اس پر سڑکیں بنائی جاتیں اور فضا کو بالکل خالی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جو دراصل انہی کاموں کے لئے بنائی گئی ہے۔ بہر حال میں چند سکند میں فضا میں اڑنا ہوا دفتر پہنچا۔ میرے دفتر میں سوائے میرے اور کوئی انسان نوکر نہیں ہے البتہ مجھ کو پانچ مشینیں ماتحت کے طور پر دی گئی ہیں۔ ایک مشین تمام خط و کتابت کرتی ہے۔ دوسری مشین حساب کتاب کی ذمہ دار ہے۔ تیسری مشین کے سپرد مختلف کام ہیں۔ مثلاً دفتر کی صفائی کاغذات کی ترتیب۔ جلد سازی اور دفتر کی تمام کام کے لئے چوتھی۔ پانچویں مشین گویا میرے بعد دفتر کی سب سے بڑی حاکم ہے۔ اس لئے کہ اس مشین سے ان تمام مشینوں کی نگرانی ہوتی ہے جو دفتر میں کام کرتی ہیں۔ اور یہی مشین ان تمام مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ اور خرابیوں کو دور کرتی رہتی ہے۔ میرا کام صرف اس قدر ہے کہ میں ضروری کاغذات پر دستخط کرتا ہوں اور اپنی میز پر سیٹھے سیٹھے بیٹن دبا کر ان تمام مشینوں سے کام لیتا رہتا ہوں۔ مثلاً کسی خط کا جواب دینے والی مشین کا بیٹن دبا کر جواب بولنا شروع کر دیا۔ اور وہی جواب باقاعدہ دفتر کے لیٹر پیپر پر (خط لکھنے کا کاغذ) لکھا ہوا

مریخ کی میر

مع ایک نقل کے میرے دستخط کے لئے آجاتا ہے۔ اسی طرح رجسٹروں میں جو ضروری اندراج ہوتے ہیں وہ بھی مبن و باکر میں بولتا جاتا ہوں اور اندراج ہوتا جاتا ہے۔ ڈاک آنے اور ڈاک جانے کے بھی یہی طریقے ہیں کہ خط لکھنے والی مشین خط اور لفافہ لکھ کر میرے دستخط کے بعد لفافہ بند کر کے خود ہی اس لٹکے میں ڈال دیتی ہے۔ جو دفتر میں لگا ہوا ہے۔ ان خاص مشینوں کے علاوہ پانی پلانے اور سگریٹ پلانے۔ دروازہ کھولنے اور دروازہ بند کرنے اور ایسے ہی چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے نئی مشینیں لگانا پڑتیں۔ مگر یہ کام بھی انہیں مشینوں پر تقسیم کر دیے گئے ہیں اور میں خوش اور مطمئن ہوں کہ میرے ماتحت انسانی ہاتھوں سے کہیں زیادہ سلیقے اور ٹھیک طریقے سے اپنے تمام فریضے انجام دیتے ہیں۔ البتہ بہر اتوار کو ایک انجینیر آتا ہے اور ان تمام مشینوں کو ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔

میں نے حسب معمول ڈھائی گھنٹہ تک کام کیا اور پھر اپنے پروں سے اڑتا ہوا گھرا گیا۔ گھرا کر معلوم ہوا کہ بیگم کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ لہذا فوراً ان کے پاس پہنچا۔ دونوں بچے اور ان کا مرعی دوست وہیں موجود تھے۔ میرے بڑے لڑکے نے مجھ کو دیکھتے ہی کہا کہ میں سیارہ زحل کے ڈاکٹر ڈوبال کو ٹیلیفون پر اس کی والدہ کا پورا حال سنا دوں۔ اور جو دوا وہ تجویز کریں اس کا استعمال شروع کیا جائے۔ مجھے اس کی رائے پسند آئی۔ اور میں فوراً ٹیلیفون کا سلسلہ سیارہ زحل سے ملا کر ڈاکٹر ڈوبال سے زحلی زبان میں مریضہ کا پورا حال کہا۔ ڈاکٹر نے نہایت غور سے تمام حال سن کر یہ تجویز

مریخ کی سیر

کیا کہ میں بیگم کو زحل کے مشہور حشمہ عقازہ کا پانی دن کو کم سے کم چار مرتبہ پلاؤں۔ اور ہفتہ میں ایک مرتبہ اسی پانی سے غسل ہو۔ یہ پانی ہماری دنیا میں بھی مشہور دو افروشوں کے یہاں ملتا ہے لہذا میں نے اسی وقت اس کا انتظام کر دیا اور اب امید ہے کہ بیگم کو اختلاج کبھی نہ ہوگا۔ میرے بچوں کا مریخی دوست بیان کرتا ہے کہ اس کی بہن کو بھی ڈاکٹر ڈو بال کے علاج سے بہت جلد فائدہ ہو گیا تھا۔ مگر اس کے لئے مریخ کی آب و ہوا کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر ڈو بال نے ہماری دنیا کی ایک دو ایجنوز کی تھی۔ یعنی ہمالیہ کی برف بہر حال یہ طے ہے کہ ڈاکٹر ڈو بال اپنے فن میں نہایت قابل ڈاکٹر ہے اور سنا ہے کہ وہ دس دس برس کے مرے ہوئے لوگوں کو زندہ کر دینے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ خیر ایسے ڈاکٹر تو ہماری دنیا میں بھی ہیں جو ایک جسم کی روح دوسرے جسم میں تبدیل کر دیں۔ مگر زحل کا یہ ڈاکٹر اپنا آپ ہی جو اب ہے۔ ابھی چند دن ہوئے کہ میرے ہی ایک عزیز فیض میں اپنے پر ٹوٹ جانے کی وجہ سے گر کر مرے اور ان کو دیکھ کر ایک دوسرا اچھا بھلا آدمی قلب کی حرکت بند ہو جانے سے مر گیا۔ چنانچہ ہماری دنیا کے مشہور ڈاکٹر عظمت نے میرے عزیز کی روح اس آدمی کے جسم میں تبدیل کر کے ان کو زندہ رکھا۔ ہر چند کہ وہ صورتاً تو مر گئے مگر روحانی طریقہ پر اب اس دوسرے شخص کی صورت میں زندہ ہیں اور اس شخص کے عزیز بھی مطمئن ہیں کہ گو ان کا عزیز روحانی طریقہ پر مر گیا ہے مگر جسمانی طریقہ پر زندہ ہے۔ مگر سارہ زحل کے ڈاکٹروں نے جو ترقی کر لی ہے اس کے مقابلے میں یہ کمالات بچوں کے کھیل سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ بیگم کو

مریج کی سیر

اس چشمہ کا پانی پیتے ہی سکون ہو گیا۔ اور وہ بیٹا ہر بالکل تندرست معلوم ہوتی ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنے بچوں کو ان کے مریخی دوست کے ساتھ لے کر ذرا نیویارک میں سینما دیکھ آؤں وہاں آج بہت عمدہ فلم آیا ہوا ہے۔ سننا ہے کہ اس فلم میں جو باغات دکھائے گئے ہیں ان کے پھولوں کی اصل خوشبو آتی ہے اور ان کے پھولوں کو اگر دیکھنے والے کھانا چاہیں تو ان کو بالکل اصلی پھولوں کا سا مزہ آتا ہے۔ بلکہ انہیں پھولوں کی ڈکاریں بھی آتی ہیں۔ یہ دراصل فلم سازی کی صنعت کا کمال ہے۔ جس کا خیال بھی اگلے زمانے کے لوگ مشکل سے کر سکتے تھے۔ سینما والوں نے لکھ دیا ہے کہ تماشائی کھانا کھا کر نہ آئیں۔ ورنہ وہ پھل نہ کھا سکیں گے۔ لہذا میں بھی آج رات کا کھانا بنا کئے دیتا ہوں۔ مگر وہاں جانے سے قبل مجھ کو غسل کرنا ہے۔ اور لباس بھی تبدیل کرنا ہے۔ خیر یہ تو چند منٹ کا کام ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی اگلے زمانے کا غسل تو ہے نہیں کہ لباس اتار کر انسان غسل خانے میں جائے اور وہاں ٹب میں بیٹھ کر نہائے۔ اب تو لباس پہننے چلتے پھرتے غسل ہو سکتا ہے۔ نہ صابن ملنا نہ جسم خشک کرنا اور نہ اپنے اوپر پانی بہانا۔ بس گیس کا ٹیوب کپڑوں کے نیچے اور جسم کے اوپر رکھا اور مکمل غسل ہو گیا۔ رہ گیا کپڑے بدلنا اس میں بھی کونسا پہاڑ کھودنا ہے۔ کپڑوں کی الماری میں گھسے اور ایک لباس اتر کر دوسرا خود بخود جسم پر آجاتا ہے صرف لباس پسند کرنے میں دیر لگتی ہے۔ بہر حال مجھ کو نہانے اور لباس تبدیل کرنے میں مشکل سے دس سکند ٹالگیں کے۔ اس کے بعد سہ پہر کی چائے ہوگی۔ اور پھر ہم سب نیویارک روانہ ہو جائیں گے۔

مریخ کی سیر

وہاں سے واپسی پر میگم کو بمبئی اتارنا ہوا میں سب کو لے کر لکھنؤ آجاؤں گا۔ میں تو سینما نہ جاتا مگر بچے چھٹیاں منانے آئے ہوئے ہیں۔ لہذا ان کی تفریح بھی ضروری ہے۔ آج یہ سینما کا پروگرام بن گیا۔ کل سنا ہے کہ دہلی میں فٹ بال ٹورنمنٹ کا فائنل میچ ہے۔ جس میں چاند کی ٹیم اور مشتری کے مشہور کھلاڑیوں کا زبردست مقابلہ ہے اور بہت سے سیاروں کے لاکھوں آدمی اس میچ کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ مجھے فٹ بال سے تو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ مگر اس موقع پر جو مجمع ہو گا وہ بجائے وہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ مختلف دنیاؤں کے باشندوں سے ملاقات ہوگی۔ اور عجیب عجیب جلیوں و شکلوں کے لوگ نظر آئیں گے۔ پرسوں چاند گرہن ہے۔ اور میرا ارادہ ہے کہ میں چاند میں جا کر گرہن کے وقت دنیا کا حال دیکھوں غالباً بچے بھی اس پروگرام کو پسند کریں گے۔ یہ تفریح کی تفریح ہے اور بچوں کیلئے ایک اچھا تعلیمی مشغلہ بھی ہے۔ مختصر یہ کہ ہر امکانی کوشش کروں گا کہ بچوں کی چھٹیوں کا زمانہ دلچسپی سے خالی نہ گزرے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے مریخی دوست کی تفریح بھی ہو جائے۔

(۳)

آج ۲۱ دسمبر ۱۹۵۷ء ہے اور میرے دونوں بچے مو اپنے مریخی دوست کے واپس جانے والے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلوں اور میں خود بھی چاہتا ہوں کہ مریخ کی اس عجیب و غریب دنیا کی سیر کر آؤں جس کے واقعات اس دنیا کے لوگ حیرت سے منہ کھول کھول کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سنتے ہیں۔ دوسرے اسی بہانے سے میگم کی تبدیل آب و ہوا بھی ہو جائے گی

مریخ کی سیر

حالات کو وہ راکٹ کے سفر سے اسی طرح ڈرتی ہیں جس طرح اگلے زمانے کی ہوسٹیل
 ہوئی جہاز سے ڈر کرتی تھیں۔ مگر مجھ کو یقین ہے کہ مریخ کے اس سفر کے بعد راکٹ
 کے سفر سے وہ نگہرائیں گی۔ بہر حال میں نے تمام دن اپنا سامان سفر درست
 کیا اور سہ پہر کو اپنے دونوں بچوں کو معان کے مریخی دوست ترنگول سلمہ اور
 بیگم کے راکٹ سے مریخ کی طرف اڑ گیا۔ ہماری دنیا اور مریخ کا فاصلہ توخیر
 بہت ہے مگر جس راکٹ پر ہم نے سفر کیا اس نے ہم کو بخیریت تمام تیسرے دن
 مریخ پہنچا دیا۔ اور ہمارا راکٹ ایک بڑے سمندر میں جا کر رکا۔ میں نے
 اس موجیں مارتے ہوئے سمندر کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ اب ہم یہاں سے جہاز
 وغیرہ پر خشکی تک جائیں گے۔ مگر میرے اس خیال کے برخلاف میرا چھوٹا بچہ
 فوراً راکٹ سے اتر آیا اور پانی کی ان خوفناک موجوں پر نہایت اطمینان کے
 ساتھ ٹہلنے لگا۔ دراصل مجھ کو اس منظر پر انتہائی تعجب ہوا اس لئے کہ اس
 قسم کے معجزوں کا ذکر انجیل مقدس میں تو ضرور پڑھا تھا۔ مگر ایسا کوئی واقعہ
 اپنی نگاہوں سے اب تک نہ دیکھا تھا۔ غالباً میرا بچہ میرے اس تعجب کو
 فوراً سمجھ گیا۔ اور اس نے مسکرا کر کہا۔

”یہاں کا یہ سمندر ہی دراصل براعظم ہے اور یہاں اسی پانی کی سطح پر لوگ اس
 طرح چلتے پھرتے دوڑتے اور اچھلتے ہیں جیسے آپ کی دنیا میں خشکی پر۔ البتہ یہاں
 کی خشکی میں انسان ڈوب جاتا ہے۔ گویا خشکی اور تری میں مریخ کی دنیا ہماری
 دنیا کی ضد ہے۔ وہاں کی خشکی یہاں کی تری ہے اور وہاں کی تری یہاں کی
 خشکی اور یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ دنیا اٹھی ہے یا وہ“

مریح کی میر

میری حیرت بدستور قائم تھی۔ مگر بیگم حیرت سے زیادہ خوف زدہ تھیں۔ اور کسی طرح ان موجوں پر چہل قدمی کے لئے تیار نہ تھیں۔ مگر جب میرے دونوں بچے اور ترنگول سب ان ہی موجوں پر اطمینان سے ٹہلنے لگے اور اس کے بعد خود میں بھی سطح آب پر ان کو دکھانے کے لئے نمونتا ایک آدھ قدم چلا تو وہ بھی زیر لب کچھ پڑھتی ہوئی راکٹ سے نکل آئیں۔ اور ہم سب ایک نئی جہاز پر بیٹھ کر آبادی کی طرف اڑ گئے۔ میں نے طے کیا کہ یہاں کسی اچھے ہوٹل میں قیام کروں گا۔ مگر عزیزی میاں ترنگول سلمہ نہ مانے اور جب میں نے دیکھا کہ ان کی ناراضگی بڑھ رہی ہے تو مجبوراً ہم سب کو ان ہی کے یہاں قیام کرنا پڑا۔ وہ خود یونیورسٹی کے ہوٹل میں رہتے تھے مگر ان کے والد محترم مکرمی ترنگول صاحب ملک ششائشہ کے دارالسلطنت دغدغہ میں راکٹ بنانے کے ایک بڑے کارخانے کے مالک تھے اور ان کی کوٹھی ایک ریگستان کے ساحل پر بنی ہوئی تھی۔ ریگستان کا ساحل میں نے اس لئے کہا کہ وہاں ریگستان کو ہی سمندر کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور ریگستانوں ہی میں جہاز رانی ہوتی ہے ترنگول صاحب کی کوٹھی غالباً نہایت نازک نازک لہروں کی بنی ہوئی تھی۔ جس میں جا بجا بہت سے جباب اور گرداب نہایت نفاست کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ اور موٹی موٹی لہروں کے ستونوں پر یہ عظیم الشان عمارت قائم تھی۔

ترنگول صاحب ہم سب سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ نہایت اخلاق بھرے انداز میں دم ہلا کر سلام کیا اور میری ناک سے اپنی ناک رگڑی۔

مریج کی سیر

یہ دراصل مریج کا مصافحہ ہوتا ہے مسز ڈرنگول نے بیگم کو اسی طرح تعظیم دی۔
 ادنیٰ کم کو ایک بڑے کمرے میں ٹھہرا دیا گیا۔ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی تین دن باقی
 تھے۔ لہذا میرے بچے بھی میرے ساتھ ہی رہے اور اس لحاظ سے اچھا
 بھی ہوا کہ مجھ کو اس نئی دنیا میں قدم قدم پر مہناؤں کی ضرورت تھی۔ اور
 ڈرنگول صاحب سے ایک ایک بات پوچھنا کچھ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ لہذا اس
 سلسلہ میں ڈرنگول سلمہ بیچارہ گویا سایہ کی طرح میرے ساتھ تھا۔ مثلاً سب سے
 پہلے تو مجھ کو غسل کرنے کی وقت پیش آئی اس لئے کہ یہاں گویا پانی کے بجائے
 مٹی سے غسل کرنا چاہیئے تھا۔ مگر ڈرنگول سلمہ نے مجھ کو اس قسم سے بچالیا اور یہ بتایا
 کہ یہاں اس قسم کے تمام کام گیس سے لئے جاتے ہیں۔ لہذا میں نے اطمینان
 کے ساتھ غسل کی تیاری شروع کر دی مگر غسل سے پہلے شیو بنانا بھی ضروری
 تھا اور یہاں میرا وہ بھلی کابرش موجود نہ تھا۔ جس سے میں ڈارٹھی بنایا
 کرتا تھا لہذا ڈرنگول نے اپنے والد محترم کی ڈارٹھی بنانے والی ٹارچ لا کر
 مجھ کو دی۔ اور بتایا کہ اس کی روشنی جہاں جہاں پڑے گی ایک ہفتہ کے لئے
 جلد بالوں سے صاف ہو جائے گی۔ یہ طریقہ مجھ کو اپنے بھلی کے برش سے
 زیادہ پسند آیا۔ مگر چونکہ اس سے شیو بنانے کا پہلا اتفاق تھا لہذا
 مصیبت یہ ہوئی کہ تھوڑی سی روشنی میری مونچھوں پر بھی پڑ گئی اور ایک طرف
 مونچھوں کا ایک حصہ غائب ہو گیا۔ میں مونچھیں بنانے کا دراصل نجات
 نہیں ہوں مگر کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔ لہذا اب نیز مونچھوں کے کچھ عجیب سا
 معلوم ہوتا ہوں۔ بہر حال اب جو آئینہ دیکھتا ہوں تو ایک طرف کی مونچھیں

مرح کی میر

تو بالکل ٹھیک تھیں اور دوسری طرف کچھ دیک لگی ہوئی سی معلوم ہوئی تھیں۔ بلکہ یوں سمجھ لیں کہ ناک کے نیچے ۲۲ کا نقشہ نظر آ رہا تھا۔ میں ابھی اپنی اس حالت پر غور ہی کر رہا تھا کہ میرے دونوں بچے آ موجود ہوئے اور میری صورت دیکھ کر لگے قہقہے اڑانے۔ باپ پر ہنسنا یقیناً بد تمیزی ہے۔ مگر میرے خیال میں ۲۲ ا مویچھ والے باپ پر نہ ہنسنا بھی سعادت مند اولاد کے لئے ایک قسم کا عیب ہے۔ اس سے ان کا ذہن کند ہو جاتا ہے اور برجستگی کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہذا میں نے ان کی ہنسنی پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ البتہ ان سے رائے لی کہ بتاؤ اب کیا کیا جائے اتنی ہی دیر میں ترنگول بھی اپنی چچی یعنی میری بیگم کو لے کر آ گیا۔ بیگم نے پہلے تو مجھ کو گھور کر دیکھا اور پھر ہنس دیں۔ میں نے نہایت افسوسناک لہجہ میں اس حادثہ کی تفصیل بیان کی۔ تو ترنگول نے فوراً کہا۔

”جی ہاں اس ٹارچ سے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ مگر ایک ترکیب ہے کہ میرے والد صاحب کے آئینہ میں آپ اپنا منہ دیکھیں۔ بال پھر سے نکل آئیں گے اور اس کے بعد آپ از سر نو اپنی ڈاڑھی بنا لیجئے گا۔“

مجھ کو اس پر سخت حیرت ہوئی۔ مگر ترنگول دوڑ کر گیا اور آئینہ اٹھا لایا۔ مگر قبل اس کے کہ میں آئینہ دیکھوں بیگم نے آئینہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا وہ تو کئے ترنگول ماشاء اللہ بڑا سمجھ دار بچہ ہے۔ اس نے فوراً آئینہ ہٹا کر نہایت خوش فرودہ انداز سے کہا۔

”کسیں ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا ایک مرتبہ خود میری والدہ نے

مریخ کی سیر

غلطی سے یہ آئینہ دیکھ لیا تھا اور ان کے چہرے پر ڈاڑھی نکل آئی تھی جو بڑی شکل سے ایک ہفتے کے علاج کے بعد دور ہو سکی۔

بیگم یہ سنتے ہی منہ پھیر کر کھڑی ہو گئیں کہ کہیں آئینہ کا کوئی ٹوخ ان کی

طرف نہ ہو جائے۔ اور میں نے آئینہ لے کر جو دیکھا تو آپ سے کیا عرض کروں کہ کس قدر نورانی قسم کی گھنی ڈاڑھی کا ایک پیدا ہو گئی۔ ایسی ڈاڑھی کہ خود مجھ کو اپنی شکل پر والد صاحب مرحوم و منفقور کا شبہ ہونے لگا۔ میں نے آئینہ فوراً رکھ دیا اور بیگم سے کہا۔

”اب بتاؤ کہ اس نورانی ڈاڑھی کو رہنے دوں یا صاف کر دوں“

بیگم تو خوفزدہ ہو کر میرے سوال کا جواب نہ دے سکیں مگر میرے

بڑے بچے نے کہا۔

”ذرا ٹھہریے اس ڈاڑھی پر ایک تصویر لے لوں پھر آپ کو اختیار

ہے“ اور میرا چھوٹا بچہ نینسل لے کر غالباً میرا کارٹون بنانے لگا۔

بہر حال تصویر کشی کے بعد میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ شیو بنایا

اور شکر ہے کہ ابکی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ لہذا میں فوراً غسل کے لئے

چلا گیا اور ایک منٹ کے اندر ہی غسل سے فارغ ہو کر میں باہر جانے

کے لئے تیار ہو گیا۔ کیونکہ مریخ کی سیر کے لئے میں بیقرار تھا۔ مگر اس سے

قبل کہ میں باہر جا سکوں تو رنگوں صاحب نے کہلا بھیجا کہ اس وقت

شکار کا پروگرام ہے۔ اگر میں ان کے ہمراہ چلنا چاہوں تو چلوں۔

میں تو تیار تھا ہی فوراً ان کے ہمراہ شکار پر روانہ ہو گیا۔ اور ایک آئی جہاں

مرچ کی میر

پر میٹھ کر ہم سب چند منٹ میں ایک گھمے جنگل میں پھونچ گئے۔ جہاں ایسے ایسے جانور تھے جو میں نے آج تک نہ دیکھے تھے۔ مثلاً سونڈ والے ہرن، اڑنے والے شیر، ہاتھی کے برابر گوش اور بہت سے ایسے چوپائے جو دنیا کے کسی جانور سے مشابہ نہیں ہوتے۔ ڈرنگول صاحب نے بتایا کہ یہاں کا بہترین شکار مینڈک کا ہوتا ہے اور مینڈک ہی یہاں کا سب سے زیادہ خوفناک چوپایہ سمجھا جاتا ہے۔ میں یہ سن کر سنبھل گیا تھا کہ ڈرنگول صاحب نے ایک طرف اشارہ کر کے بتایا کہ مینڈک وہ آ رہا ہے۔ اب جو میں دیکھتا ہوں تو واقعی وہ نہایت خوفناک مینڈک تھا۔ شکل و صورت تو بالکل مینڈک کی ایسی تھی مگر قد و قامت میں وہ گینڈے سے کم نہ تھا۔ ڈرنگول صاحب نے پہلے تو ایک پستول نکال کر نشانہ باندھا اور پھر پستول کی سبلی جو دبائی تو بجائے آواز پیدا ہونے یا کار تو س منگنے کے اس میں سے ایک خاموش قسم کی روشنی کی لہر نکلی اور وہ چوڑیاں بھرتا ہوا خوفناک مینڈک گویا اپنی جگہ پر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے کسی نے باندھ دیا ہو۔ اس کے بعد ڈرنگول صاحب نے بندوق کی نامی میں گھٹی، نمک، مرچ اور مسالہ وغیرہ بھر کر جو فارٹ کیا تو وہ مینڈک وہیں پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ آخر اس میں گھٹی، مرچ وغیرہ کیوں بھرا تھا تو ڈرنگول صاحب نے بتایا کہ یہاں شکار اسی طرح ہوتا ہے اب اس جانور کو پکانے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ آپ کو اس کا گوشت نہایت عمدہ بھنا بھنایا اور چھٹا، مسالہ دار لے گا۔ میں حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا۔ اور ڈرنگول صاحب نے اپنا شکار اٹھا کر ہوائی جہاز پر لاد دیا۔ اب ہم واپسی کی

مریخ کی سیر

تیاریاں کر رہے تھے کہ میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ایسا منظر جو اس دنیا والے خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یعنی ایک اونٹ اڑتا ہوا بالکل ہمارے سر پر سے گزر گیا۔ میں نے حیرت سے کہا یہ کیا ہے۔ تو ڈرنگول صاحب نے نہایت لاپرواہی سے کہا۔ کہ یہ اونٹ ہے۔ نہایت قیمتی پرندہ ہوتا ہے اور اہل مریخ عام طور پر اسی کے دودھ کی چائے وغیرہ پیتے ہیں۔ وہ اونٹ کی تعریف کرتے رہے اور میں حد نظر تک اس کی اڑان کا تماشہ دیکھتا رہا۔ آخر ڈرنگول صاحب نے کہا کہ۔ اب چلنے پچھ آتظار کرتے ہوں گے۔ اور کھانے کا وقت بھی قریب ہے۔ میں نے کہا کہ کم سے کم شام تک اس جنگل میں ٹھہریں۔ یہاں تو عجیب و غریب چیزیں ہیں۔ مگر شام کا نام سن کر وہ ہنسنے لگے۔ اور دیر تک ہنسنے کے بعد بولے کہ غالباً آپ اپنی دنیا کی طرح شام کو بہت قریب سمجھ لیے ہوں گے۔ حالانکہ یہاں بارہ بارہ گھنٹے کے دن اور رات نہیں ہوتے بلکہ ایک ہفتہ کے برابر دن اور ایک ہفتہ کے برابر رات ہوتی ہے۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا اس لئے کہ میرے نزدیک ایک ہفتہ تک مسلسل جاگنا کوئی آسان کام نہ تھا اور اس سے زیادہ مشکل ایک ہفتہ تک سلسل سونا تھا۔ مگر اب تو اسی دنیا میں چند دن رہنا تھا۔ اور اسی کے صبح و شام کی پابندی کرنا تھی۔

لہذا نہایت خاموشی کے ساتھ ڈرنگول صاحب کے ہمراہ واپس گیا۔ واپسی پر میں نے دیکھا کہ مسز ڈرنگول اور بیگم چھوٹی چھوٹی ٹھہریاں لگائے نصاب میں پرداز کر رہی ہیں۔ اور میرے بچے ڈرنگول کے ساتھ اپنی کوٹھی کے سامنے والے میدان میں پیرا کی کے کمالات دکھا رہے ہیں۔ دراصل میرے لئے

مرنج کی سیر

یہ تمام مناظر کچھ ایسے عجیب و غریب تھے کہ میں کبھی کبھی یہ محسوس کرتا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ مناظر دیکھنے کے فوری بعد ہم لوگ کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔ مگر اب یہاں مصیبت یہ تھی کہ پہلے کھانا کھانا سیکھیں اس کے بعد اس کی مشق کریں۔ پھر کہیں کھانے کی نوبت آئے۔ اس لئے کہ کھانے کی میز کے بیچ میں تو تمام لذیذ کھانے چنے ہوئے تھے۔ اور ہر کرسی کے سامنے چھوٹے چھوٹے ٹائپ رائٹر رکھے ہوئے تھے۔ میں حیران تھا کہ کھانے کی میز پر ٹائپ رائٹر کا کیا تک ہے۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ یہاں ان ٹائپ رائٹروں ہی سے کھانا کھایا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے ایسی ہی مشق کی ضرورت ہوتی ہے جیسی کسی زمانہ میں ٹائپ کرنے والوں کے لئے مشق کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ڈرننگ ٹیبل صاحب نے بیٹھے ہی اس مشین پر انگلیاں چلانا شروع کر دیں اور اسی رفتار سے جلد جلد مختلف چمچے مختلف پلیٹوں سے اٹھا اٹھ کر ان کے منہ میں جانے لگے۔ میں پہلے تو حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ان کی نقل جو میں نے کی اور ایک بار مشین پر انگلیاں چلانی تو تین خالی چمچے میرے منہ میں گھس گئے۔ اس پر سب کو ہنسی آگئی۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ میں نے اتفاق سے ان بٹنوں پر انگلیاں رکھ دی تھیں جو پڈنگ اور سلا دور ایئر کے لئے تھے اور یہ چیزیں اس وقت کے کھانے پر نہ تھیں۔ بہر صورت امیابے کہ چند دن میں مجھ کو ٹائپ شدہ کھانا آجائے گا۔

مریج کی سیر

آج ۵۲ برس کے ماہ جنوری کی پانچویں تاریخ ہے۔ گویا اس حیثیت سے دنیا کے حساب کے مطابق مجھ کو دنیا چھوڑے ہوئے آج پندرہواں دن ہے۔ لیکن اس مریج کی دنیا میں ایک ہفتہ کا دن اور ایک ہفتہ کی رات ہوتی ہے۔ اور اس اعتبار سے گویا ابھی دو سہرا ہی دن ہے۔ مگر آپ کو یہ سہا کہ خوشی ہوگی کہ میں نے اس تھوڑے عرصہ میں اس دنیا کی خوب سیر کر لی ہے۔ اور اپنے نزدیک جو کچھ دیکھا ہے دو کیا دو ہزار آنکھیں بھی پاتے تو مریج کی دنیا کے ان مناظر کو دیکھ کر

حیران ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دکھوں

کے بجائے یہی کہتے کہ

دو ہزار آنکھیں بھی حیراں ہیں کہ کیا کیا دیکھیں

یہ دنیا ہماری دنیا سے بہت زیادہ بڑی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے مریج کا کونہ کونہ چھان مارا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اس دنیا کے چپہ چپہ پر اپنا پسینہ ٹپکایا ہے۔ ہر بڑا عظیم کاہر ملک اور ہر ملک کا ہر شہر دیکھا۔ مشہور تاریخی مقامات کی سیر کی اور اس عجیب و غریب دنیا کے وہ حالات دیکھے جو میرے خواب و خیال کے لئے بھی ناممکن تھے میں چاہتا ہوں کہ ان تمام حالات کو ترتیب کے ساتھ پیش کروں تاکہ مریج کی دنیا کا کوئی واقعہ نہ نہ جائے۔ دراصل اس دنیا کا تمام تر دار و مدار سائنس کی حیرت انگیز ترقی پر ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ہماری دنیا کے ماہرین سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہوتی تو آج ان میں کاہر سائنس داں

مریج کی سیر

اپنی اپنی جگہ خدا بن کر بیٹھ جا تا مگر مریج کے یہ باکمال سائنس داں اپنی ان ترقیوں کے باوجود یہی سمجھتے ہیں کہ ابھی تک ابتدائی منزلیں طے نہیں ہوئی ہیں۔ ورنہ سائنس تو وہ علم ہے جو انسان کو اپنی ہر نبیوری پر فائدہ پہنچانے کے قابل بنا سکتا ہے۔ مثلاً ہماری دنیا کے سائنس داں ابھی تک موت پر قابو حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ مگر مریج کے سائنس داں یہ منزلیں طے کرنے کے بعد اس فکر میں ہیں کہ انسان اپنی مرضی کے مطابق مختلف جسم کیوں کر لے سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں میرے میزبان محترم ٹرانزنگول کے گھر ہی میں ایک عجیب و غریب مثال موجود ہے۔ یہی آپ کے برادر عزیز ٹرانزنگول صاحب کو بیویوں سے بڑی دلچسپی تھی اور آپ اس جانور کی صفائی اور مسکینیت کے ایسے دلدادہ تھے کہ آخر کار آپ نے یہی کوشش کی کہ خود آپ کو قلی بنا دیا جائے۔ چنانچہ یہاں کے ایک مشہور سائنس داں نے آپ پر اپنا عمل شروع کیا اور اس یقین کے ساتھ کہ اگر عمل ناکام بھی ہوا تو پھر آپ کو انسان بنا دیا جائے گا اور پھر آپ کو قلی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر خدا جانے کیا غلطی ہوئی کہ آپ بجائے قلی بننے کے کتابن کر رہ گئے۔ پھر ایک مصیبت یہ ہوئی کہ کتے بھی نہایت مستقل قسم کے بنے۔ یعنی اس وقت سے اب تک براہیہی کوشش کی جا رہی ہے کہ آپ کو یا تو انسان بنا دیا جائے یا آپ کی مرضی کے مطابق قلی کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے۔ مگر اب تک ہر کوشش ناکام ہے۔ میں نے توجیب اس کتے کو دیکھا تو یہی سمجھا کہ یہ پالتو کتا ہے۔ مگر ایک روز ٹرانزنگول سلوانے اس کو نہایت ادب کے ساتھ چچا جان کہا تو مجھ کو بڑی ہنسی آئی کہ یہ لڑکا بھی

مرخ کی سیر

عجیب معجزہ ہے جو کتے کو چچا کہتا ہے۔ مگر میری اس ہنسی پر ڈرن گول صاحب نے ایک آہ سرد دیکھ کر یہ قصہ سنایا۔ اور اس وقت سے میں اس کتے کی زندگی کا عجیب و غریب تماشہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ صورتاً تو کتا ہے۔ وہی منہ اور وہی اگلی پچھلی ٹانگیں۔ بلکہ بالکل وہی دم مگر اس شکل و صورت کے بعد اس میں اب تک بہت انسانی حرکتیں بھی ہیں۔ مثلاً وہ بول تو سکتا نہیں مگر سنتا اور سمجھتا سب کچھ ہے بلکہ یہ کتا روزانہ صبح کے وقت چشمہ لگا کر تازہ ترین اخبار پڑھتا ہے۔ سگریٹ پیتا ہے اور کھانے میں بھی انسانوں کی طرح نفاست سے کام لیتا ہے۔ گھر کے نوکر چاکر سب اس کو ڈرن گول کا بھائی سمجھ کر چھوٹے ٹسرا کرکتے ہیں اور ترنگول تو واقعی نہایت سعادت مند بچہ ہے جو ایک کتے کو بھی چچا جان کتے ہوئے نہیں شرماتا۔ حالانکہ آج کل کے لڑکے اپنے باپ تک کو جو کتا نہیں انسان ہوتا ہے باپ کتے ہوئے شرماتے ہیں۔ بہر حال اس کتے کی زندگی بھی نہایت عبرت انگیز ہے مگر ڈرن گول صاحب کو اطمینان ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور انسان بن جائے گا اور یہ جو کچھ ہے دراصل اس کو انسانی زندگی پر مٹی کی زندگی کو ترجیح دینے کی سزا مل رہی ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو مگر ذرا غور کیجئے کہ یہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ یہاں کے سائنس دان ایک انسان کے گوم تک لگا سکتے ہیں۔ خواہ وہ کتے کی ہو یا بلی کی میں نے ایک روز ترنگول سلمہ سے کہا کہ تم اپنے چچا کی طرح اپنی انسانی شکل تبدیل نہ کرنا تو اس نے ہنس کر کہا کہ میرے چچا نے میرے علاوہ بہت سے مرخی نوجوانوں کو جو اس قسم کا ارادہ کر سکتے تھے ایک عبرت کا سبق ہمیا کیا ہے اور مجھ کو اگر اپنی شکل ہی تبدیل کرنا ہوگی

مریخ کی میر

تو میں آپ کی دنیا کا انسان بنوں گا۔ مجھ کو یہ مچھلی کا جسم اچھا نہیں لگتا۔ میں نے یہ سن کر ترنگوں کے گالوں پر محبت سے ایک طمانچہ مارا۔ اور وہ ہنسنے لگا۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مریخی سائنس دانوں کے یہ تجربے ابھی ناکام ہیں مگر ایک نہ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس و ایجادات کے سلسلے میں مریخ کی دنیا ہماری دنیا سے بہت آگے ہے اور ہر شعبہ میں مریخ والے جہاں تک پہنچ چکے ہیں وہاں ہماری دنیا صدیوں میں پہنچے گی۔ صرف ایک ریڈیو ہی کو لے لیجئے۔ ہماری دنیا کو اس پر ناز ہے کہ اگلے زمانے میں بغیر کسی سلسلے کے محض ہوا کے زور پر ایک جگہ کی آواز دوسری جگہ پہنچا دینے کو کمال سمجھا جاتا تھا مگر اب جس شخص کی آواز ہو اس کی تصویر بھی پہنچ جاتی ہے لیکن مریخ والے ریڈیو کی اس ترقی پر ہنستے ہیں اور واقعی ان کو ہنسنا بھی چاہیے اس لئے کہ یہاں تو ریڈیو ایک ایسے جینے جاگتے جادو کا نام ہے جو سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ یہاں محض آواز سننے والے آئے جو ہیں وہ تو اتنے چھوٹے ہیں کہ عورتیں اپنے کانوں کی کیلوں میں تکیے کی طرح جڑ والی تپتی ہیں اور مرد اپنی ٹائی کی پن میں یہ آلہ لگوا لیتے ہیں اور آواز آتی رہتی ہے لیکن دراصل حیرت انگیز آلے وہ ہیں جو ایک میز کی شکل میں ہر گھر میں پائے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ محض میز ہوتی ہے لیکن جس وقت اس کا بٹن دبائیے فوراً بے شمار شعاعیں اس میز کے اوپر پیدا ہو کر اسی شخص کو میز پر کھڑا کر دیتی ہیں جو تقریر کرتا یا گاتا ہے۔ یہ شخص ہو ہو نظر کے سامنے ہوتا ہے۔ وہی قد و قامت وہی رنگ

مریج کی سیر

اور وہی ہر بات جو نقل کو مطابق اصل بنا دے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ اگر آپ اس مجسمہ کو چھونا چاہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جس چیز کو آپ چھو رہے ہیں وہ صرف عکس ہے میں نے ٹرانسپارنٹ صاحب کے ریڈیو پر اکثر تقریریں سنیں۔ مگر ایک دن ایک تقریر اس قسم کی سنی کہ ایک صاحب ہوائی جہاز پر کہیں سفر کر رہے تھے اور اسی سلسلے میں تقریر بھی فرما رہے تھے چنانچہ وہ مع اپنے ہوائی جہاز کے نظر آئے۔ مجھ کو چونکہ ریڈیو کے معاملات سے دلچسپی ہے لہذا میں نے ٹرانسپارنٹ صاحب سے پوچھا کہ آخر یہ تقریر کیونکر اور کیسے براڈ کاسٹ ہوئی ہے اس لئے کہ یہ حضرت تو سفر میں ہیں اور ہوائی جہاز میں براڈ کاسٹنگ اسٹیشن بھی نہیں۔ ٹرانسپارنٹ صاحب نے نہایت بے پروائی سے کہا کہ یہ کون سی بات ہے۔ دراصل یہاں جتنے ریڈیو اسٹار ہیں۔ ان کو کبھی لازمی طور پر براڈ کاسٹنگ اسٹیشن نہیں جانا پڑتا۔ بلکہ براڈ کاسٹنگ کے محکمہ کی طرف سے ان کو ایک جیبی اسٹیڈیو اس قسم کا دے دیا گیا ہے جس میں عکس ریز آئینہ بھی ہے اور آنڈر سٹریٹ بھی چنانچہ وہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں وقت مقررہ پر پروگرام کے مطابق براڈ کاسٹنگ شروع کر دیتے ہیں۔

مجھ کو اس انتظام پر رشک سا ہوا اس لئے کہ ہماری دنیا میں اس قسم کا جیبی اسٹیڈیو دینا تو کیا معنی ریڈیو اسٹار کو براڈ کاسٹنگ کی طرف سے ریڈیو تک نہیں دیا جاتا۔ اور وہ خود اپنے سو کام چھوڑ کر براڈ کاسٹ کرنے کے لئے مقررہ وقت پر ریڈیو اسٹیشن جاتا ہے۔ ٹرانسپارنٹ صاحب نے بتایا کہ ریڈیو اسٹیشن تو خیر یہاں بھی نہایت باقاعدہ بنے ہوئے ہیں اور بہت سے مقررہ ریڈیو اسٹیشن

مریج کی سیر

ہی تقریر کرنا پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً گانے کا پروگرام عام طور پر ریڈیو اسٹیشن ہی میں ہوتا ہے۔ تاکہ گانے والا اور ساز والے سب ایک جگہ پر ہوں۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ گانے والا ہوائی جہاز پر سفر میں ہے۔ طبلہ بجانے والا اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ پیانو ماسٹر کسی اور جگہ ہے اور دوسرے سزا زدہ کہیں اور لیکن پروگرام میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے سے سیکڑوں میل دور رہ کر پروگرام کی تکمیل کرتے ہیں اور باوجود اس دوری کے گانے اور ساز کی سنگت میں ذرا بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس شتم کے موقعوں پر جو عکس آتے ہیں۔ وہ قابل دید ہوتے ہیں کہ گانے والا ہوائی جہاز میں نظر آ رہا ہے۔ طبلہ والا اپنے کھیت میں بیٹھا طبلہ بجا رہا ہے۔ پیانو ماسٹر اپنی سسرال میں پیانو بجا رہا ہے اور کوئی سزا زدہ ہوائی سائیکل پر لے نوازی کر رہا ہے تو کوئی ساحل سمندر پر بیٹھا جل ترنگ بجا رہا ہے۔ مگر جب یہ سب آواز بن یکجا ہوتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب ایک ہی کمرے میں بیٹھے ہیں۔ میں نے زرنگول صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھ کو یہاں کا کوئی ریڈیو اسٹیشن دکھا دیجئے۔ تو انہوں نے فرمایا دکھانا کیا معنی ریڈیو والے تو آپ کی تقریر براڈ کاسٹ کرنے کے لئے بیقرار ہیں اس لئے کہ آپ اس دنیا کے انسان ہیں لیکن مرتختانی زبان بھی جانتے ہیں اور ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ اس دنیا کے ریڈیو اسٹار بھی ہیں۔ بہر حال اب میں ان کو اطلاع دینے دیتا ہوں کہ آپ اپنی تقریر براڈ کاسٹ کرنے کو تیار ہیں۔ میں اس شوق میں بغیر معاوضہ معلوم کئے خاموش

مریخ کی میر

ہو گیا کہ مجھ کو ایک جیبی اسٹیڈ یوٹے گا اور میں اس کو اپنی دنیا میں لے جا کر ریڈیو اسٹیشن کی حاضری سے بچ جاؤں گا۔ چنانچہ میری تقریر کا نہایت شاندار طریقہ پر اعلان ہو گیا۔ اور جیبی اسٹیڈ یوٹے پر قبضہ کرنے کے بعد ہی سب یہی سمجھا کہ میں ریڈیو اسٹیشن ہی سے تقریر کروں اور وقت مقررہ پر اسٹیشن پہنچ گیا۔ ریڈیو اسٹیشن دفعہ کار مرکزی اسٹیشن تھا۔ اس میں مختلف اسٹیڈیو تھے۔ جس اسٹیڈیو میں میں پہنچا یا گیا وہ دراصل جانوروں کے لئے مخصوص ہے اور چونکہ مجھ کو بھی یہاں کی دنیا میں زندہ عجائب خانہ کی ایک عجیب الخفقت جانور کی حیثیت حاصل تھی۔ لہذا میرا شمار بھی غالباً جانوروں میں کیا گیا۔ بہر حال میرے وہاں پہنچنے ہی اعلان کرنے والے صاحب بھی تشریف لے آئے اور پہلے تو دیر تک چاروں طرف گھوم گھوم کر مجھ کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد مجھ کو سونگھا۔ پھر ان کو آداب مجلس کا خیال آیا اور ناک سے ناک رگڑ کر مصافحہ کرتے ہوئے بولے کہ اب میں تقریر کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں اور شیشے کی اس قد آدم اچار وانی میں جا کر بیٹھ جاؤں جو کمرہ میں ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ میں ان کے حکم کی تعمیل میں اپنے کوجاگر یا سیب کا مربہ یا آم کا اچار سمجھ کر اس اچادانی میں جا کر کھڑا ہو گیا اور فوراً ہی وہ اچادانی مختلف قسم کی روشنیوں سے جگمگا اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کرنے والے صاحب نے اعلان کیا۔

”یہ دفعہ ہے اور ہم منہ سے بول رہے ہیں۔ آج دنیا کے ایک صاحب جو مریخ کی میر کے لئے آئے ہوئے ہیں آپ کے پیش نظر ہیں ان صاحب کا ہاتھ

مریخ کی سیر

درست ہے اور ان کو کوئی مرض ایسا نہیں جس کے جراثیم آپ کو نقصان پہنچائیں۔
لہذا آپ ان کی تقریر نہایت شوق سے سن سکتے ہیں اور آپ کو ان کے عکس سے
دور سٹننے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ یہ صاحب اپنی تقریر کے دوران
میں چھپکنے اور ڈکار لینے سے پرہیز کریں گے اور اس کی احتیاط رکھیں گے کہ یہاں
عقو کتا سخت منع ہے کیونکہ اس سے بیماری پھیلتی ہے۔“

یہ اعلان میرے لئے عجیب و غریب تھا مگر میں نے اپنے چہرے سے حیرت
کے آثار پیدا نہ ہونے دیئے اس لئے کہ میری وحشت سنے اور دیکھنے والوں تک
پہنچ جانے کے خطرے میں مبتلا تھی۔ بہر حال میں نے اعلان کے بعد نہایت
فصاحت کے ساتھ مختصاتی زبان میں اپنی دنیا کے حالات بیان کئے اور دیر
تک تقریر کرتا رہا۔ آخر اس اجار دانی کی روشنی گل ہو گئی اور میں باہر آیا۔ تو
اعلان کرنے والے صاحب نے مجھ کو میری تقریر کی کامیابی پر مبارکباد دی۔
اور ایک لفافے میں ایک ایسا چمک دیا جس کی رقم کے اعداد کا حجم کو اس وقت
علم ہو جب گھر آکر ڈرنگول صاحب سے اس کے متعلق آگہ لگو ہوئی۔ وہ رقم
کیا تھی اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اگر دنیا میں زندگی بھر
ریڈیو پر تقریریں کرتے رہیں تو بھی بحیثیت مجموعی اتنی رقم نہیں مل سکتی جتنی اس
ایک تقریر کے معاوضہ میں ملی تھی۔

مریخی جتزی کی تاریخیں اور ہفتے کم سے کم میری سمجھ میں تو آتے ہیں۔ لیکن سیر
حساب سے اگر میری گھر ملی ٹھیک ہے اور اس کی تاریخ والی سوئی غلط نہیں

مرکب کی سیر

جل رہی ہے تواج ۹ اسی عشرہ ہے۔ معلوم نہیں اس وقت میری دنیا میں دن ہوگا یا رات۔ مگر یہاں تو خدا خدا کر کے اب دن ختم ہوا ہے اور رات شروع ہوئی ہے۔ مگر حسب یہ رات بھی عجیب و غریب رات ہے کہ جب چاہے دن بنا لیجئے ورنہ رات تو ہے ہی دن کو رات بنا کر تو خیر آہاں کام ہے کہ کسی تاریک کمرے میں بیٹھ جائیے ایک کتا بھونکنے پر تعینات کر دیجئے۔ لیجئے رات ہو گئی مگر رات کا دن بنا کر کھیل نہیں ہے اور نہ اس کی ترکیب میرے دنیاوی ذہن میں آسکتی تھی مگر یہاں جیسے ہی رات شروع ہوئی میرے میزبان ڈرنگول صاحب نے مجھ کو فوراً ایک چشمہ دیدیا۔ اس کو اپنے پاس رکھئے جس وقت اس کو آپ آنکھوں پر لگائیں گے رات کی یہ تمام تاریکی دور ہو جائے گی اور یہی سیاہ رات روز روشن نظر آنے لگے گی میں پہلے تو سمجھا کہ ڈرنگول صاحب کی طبیعت اس وقت موزوں ہے اور آپ مذاق فرما رہے ہیں مگر جب میں نے چشمہ لگا یا تو معلوم ہوا کہ اس وقت رات کا خیال بھی ذہن میں نہیں آسکتا ہیں تمہیں کے ساتھ دو تین مرتبہ جلدی جلدی چشمہ کو لگایا اور اتارا اور اس کے بعد اس چشمہ کی کرامت کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ میں نے ڈرنگول صاحب سے کہا کہ اس چشمہ کا ایک نہایت دھندلا سا خاکہ ہمارے دنیا کے لوگوں نے بھی بناتا ہے مگر وہاں یہ چشمہ اسی قدر کام دے سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے کہ رات کو کتب بینی کرے یا اخبار پڑھے تو اس کو روشنی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کم کا چشمہ لگا کر پڑھنے والا بخوبی پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر کھنا چاہے تو لکھ بھی سکتا ہے۔ ڈرنگول صاحب نے اپنے چشمہ کے مقابلہ میں اس چشمہ کا ذکر سن کر حیرت سے کہا یہ تو بڑی طوالت ہے کہ اخبار پڑھنے کے لئے چشمہ لگائیے اور پھر پڑھئے ہمارے یہاں تو یہ قاعدہ ہے کہ مرنج بھر میں جتنے رات کے اخبارات شائع ہوتے ہیں وہ سب ریڈیم کی روشنائی سے چھاپے جاتے ہیں اور اندھیرے میں ان کو بخوبی پڑھا

جاسکتا ہے نہ چشمہ کی ضرورت نہ روشنی کی۔ میں نے تعجب سے کہا کہ ریڈم کی روشنائی بھی ہوتی ہے تو ڈرنگول صاحب نے فوراً ایک کتاب الماری سے نکال دکھائی۔ واقعی اس کتاب کو پڑھنے کے لئے روشنی کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ تمام حروف خود ہی جگمگاتے ہیں اور جس قدر اندھیرا ہو اسی قدر ان حروف کی روشنی زیادہ ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے گویا کتاب نے جگنو کی دم اس کتاب کی کتابت کی ہے۔ یا روشنائی میں سارے میں گرگول دیئے ہیں۔ میں اس کتاب کو حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ ڈرنگول صاحب نے فرمایا کہ اس میں شک نہیں کر ریڈیم کی چھپائی کا یہ طریقہ نہایت اچھا ہے مگر اب تو یہ بھی ختم ہوتا جاتا ہے بلکہ بڑے بڑے اخبارات اور کتابوں کے پبلشراب اس کو بھی مناسب نہیں سمجھتے کہ پڑھنے کے لئے آنکھوں پر زور دیا جائے اس لئے اب تو آنکھیں بند کر کے کتاب اور اخبار پڑھنے کا طریقہ بہت مقبول ہو رہا ہے۔ یقین جانتے کے حیرت کے مارے ہاتھ سے کتاب گرتے گرتے بچی مگر میں نے فوراً ڈرنگول صاحب کا منہ دیکھا کہ یہ حضرت کہیں اب مذاق کی طرف رجوع نہیں ہوئے ہیں۔ مگر وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ البتہ اگر حیرت نے مجھ کو مضحکہ خیز بنا دیا ہو تو دوسری بات ہے میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ڈرنگول صاحب سے کہا کہ آنکھ بند کر کے پڑھنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بغیر ناک کے سونگھا اور بغیر کان کے سنا جائے۔ ڈرنگول صاحب نے بدستور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ جی ہاں آنکھ بند کر کے پڑھنے سے میری مولد یہ ہے کہ اب تو اس قسم کے اخبارات جاری ہو رہے ہیں۔ جن کو آپ گراموفون کی مشین پر رکھ دیں اور وہ خود ہی بولنے لگیں۔ وہ خود ہی خبریں سنائے لگیں خود ہی مضامین پڑھتے ہیں اور خود ہی تمام عبارت جو اس اخبار میں ہوتی ہے آپ کو

مریخ کی سیر

سنا سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔ تو پھر یہ کہنے کہ گراموفون کی پلیٹوں پر اخبارات چھپتے ہوں گے نذرنگول صاحب نے میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی کہا۔

کہ جی نہیں بلکہ کاغذ پر البتہ وہ کاغذ اسی مسالے کا ہوتا ہے۔ جس کے کسی زمانے میں گراموفون ریکارڈ ہوا کرتے تھے۔ مگر اب کاغذ کو اس مسالے میں ملا کر بالکل کاغذ ہی کی طرح یا ایک۔۔۔ ہلکا چمکدار اور ہر طرح مڑ جانے والا بنا دیا گیا ہے۔ یہ اخبارات بالکل کاغذ کے ہوتے ہیں۔ مگر گراموفون کی مشین یا دستی ساؤنڈ بکس سے بالکل گراموفون کی طرح ہوتے ہیں میں نے کہا کہ یہ دستی ساؤنڈ بکس کیا بلا ہے تو نذرنگول صاحب نے بتایا کہ ان متکلم اخبارات کے جو سالانہ خریدار ہوتے ہیں۔ ان کو اخبار والے اپنی طرف سے ایک دستی ساؤنڈ بکس دیتے ہیں۔ جو انگوٹھی کی شکل کا ہوتا ہے۔

تہایت خوبصورت اور بالکل ایک قیمتی انگوٹھی کی شکل کا جب آپ اخبارات سنا چاہیں تو اس انگوٹھی کو اخبار کے صفحہ پر چھوڑ دیجئے۔ وہ خود ہی تمام حروف پر پھرے گی اور آپ اخبار سن لیں گے۔ اس کے بعد آپ پھر انگوٹھی پہن سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر نذرنگول صاحب نے مسز نذرنگول کو آواز دیا اور ان کے آتے ہی ان کی انگلی سے انگوٹھی اتار کر مجھ کو دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ ہے وہ انگوٹھی میں خود تو کسی متکلم اخبار کا خریدار نہیں ہوں مگر یہ ایک اخبار کی سالانہ خریدار ہیں۔ لہذا ان کے پاس ہے انگوٹھی۔

مسز نذرنگول نے جلد ہی سے کہا کہ صرف انگوٹھی سے آپ کیا سمجھیں گے۔ میں اپنے اخبار کا ایک پرچہ بھی لے آؤں تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر

مریخ کی سیر

۵۵ اخبار لینے گئیں اور میں اس انگوٹھی کو اونٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ واقعی یہ محض ایک انگوٹھی تھی اور بہت خوبصورت کوئی اس کو ساؤنڈ یا کس کہہ ہی نہیں سکتا۔ یوں تو یہ مریخ والے اونٹ تک کو پرند کہتے ہیں اور کہتے کیا ہیں میں تو خود اونٹ کو اڑتے دیکھ چکا ہوں اور مینڈک کا درندہ ہونا بھی مجھ کو یاد ہے۔ بہر حال مسز ڈرنگول جس وقت اخبار لے کر آئیں تو میں نے دیکھا کہ وہ معمولی کاغذ پر چھپا ہوا اخبار تھا البتہ اس کے حروف کچھ دندائے دار ضرورتاً مسز ڈرنگول نے کہا اب آپ اس انگوٹھی کو اس اخبار کے کسی صفحہ پر کہیں رکھ دیجئے۔ میں نے انگوٹھی ایک جگہ رکھ دی اور وہ حروف پر اس طرح چلنے لگی جیسے کوئی پرپوش ڈانس کرنے میں باریکیاں اور فن رقص کے کمالات دکھائے اسی کے ساتھ اس اخبار نے اس طرح بولنا شروع کیا کہ گویا کوئی اخبار کے ساتھ خود اڈیٹر صاحب چھپ کر آگئے ہیں۔ اور اپنا اخبار خود ہی سنار ہے ہیں۔ اس وقت یہ اخبار جو خیز سنار ہاتھادہ ایک جلسہ کا ذکر تھا۔ چنانچہ اڈیٹر نے صرف یہ لکھا تھا کہ آج ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں دغدغہ کے مشہور مقرر شروع نے تقریر کی اس کے بعد ہی وہ تقریر سننے میں آئی۔ جس کا لب و لہجہ اور آواز بالکل جداگانہ تھی۔ ڈرنگول صاحب نے فوراً مجھ سے کہا کہ دیکھئے بولنے والے اخبارات کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ مقرر کی اصلی آواز سن رہے ہیں۔ اس تقریر کی رکارڈنگ جلسہ گاہ میں ہوتی ہوگی اور جو خود سنار بول رہا ہے۔ ڈرنگول صاحب یہ باتیں سمجھا رہے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ

مرح کی سیر

میرا منہ دیکھ رہی تھیں جو اس وقت قابل دید ہو گا۔ مگر میں خود اس انگوٹھی کی حرکت دیکھ رہا تھا۔ کبھی تو وہ دلکی چلتی تھی۔ اور کبھی اس کی رفتار میں کمر واناچ کی ادا آجاتی تھی۔ کبھی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پیراک پیراکی کے چوہا دکھا رہا ہے اور کبھی وہ انگریزی مارچ شروع کر دیتی تھی۔ ہر مرتبہ وہ اس تیزی کے ساتھ گھومتی تھی کہ گویا یہ تمام راستے اس کے جانے بوجھے ہیں۔ میں ان مناظر میں کھویا ہوا تھا کہ یکایک مسز ڈرنگول نے ٹھنک ٹھنک کر اپنے شوہر نام دار سے کہنا شروع کیا کہ ان کو شیشے والے اخبار کا خریدار بنا دیا جائے ڈرنگول صاحب نے بچوں کی طرح سمجھانا شروع کیا کہ وہ اخبار بہت ہنٹکا ہے۔ اس کو غریب آدمی نہیں خرید سکتے مگر بیگم صاحبہ بدستور جھلی رہیں یہاں تک کہ منجھ کو بھی انگوٹھی کا رقص چھوڑ کر ان کے ناچ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور میں نے کہا کہ صاحب یہ شیشے والا اخبار کیسا؟ ڈرنگول صاحب نے بتایا کہ حال ہی میں ایک اخبار ایسا جاری ہوا ہے جو اپنے خریداروں کو ایک ایک شیشے کی میز دیتا ہے۔ اس میز کو آپ کمرے میں رکھ دیجئے اور بجلی سے اس کا سلسلہ ملا دیجئے تو یہ اخبار ہر گھنٹہ کی تازہ خبریں آپ کو اس طرح پہنچاتا رہے گا کہ میز گھنٹی بجائے گی اور اس کے بعد اس کی سطح پر کچھ حروف پیدا ہو جائیں گے آپ ان کو پڑھ لیجئے اور پھر وہ فوراً ہی مٹ جائیں گے۔ میں نے کہا کہ ہے تو یہ بھی عمدہ چیز خاص طور پر تازہ خبریں معلوم کرنے کے لئے مگر میرے خیال میں یہ بولنے والا اخبار اور یہ انگوٹھی زیادہ دلچسپ چیز ہے۔ مسز ڈرنگول کو میری یہ بات شاید پسند

مریخ کی میر

نہیں آئی اس لئے کہ ان کا ستر کچھ پھول گیا اور وہ احتجاجاً اپنی دم سمیٹ کر آرام کو کسی پریٹ گئیں۔ ڈرننگول صاحب نے کہا کہ صاحب دلچسپ ہو یا نہ ہو مگر اس اخبار کا سالانہ چندہ بہت ہے حالانکہ اس میں اسی دقیقہ نوی طریقہ پر عمل کیا گیا ہے جس کو اگلے زمانہ والے ٹیلی ویژن کہتے تھے جس میں کسی ایسی چیز کا طرفدار نہیں ہو سکتا جو جدت سے خالی ہو اس میں جدت بالکل نہیں ہے بلکہ ستر و ک چیز کو پھر جاری کیا جا رہا ہے۔ اور گڑے مردے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ مسز ڈرننگول نے اٹھلا کر کہا کہ آپ کی بلا سے آپ میرے نام یہ اخبار جاری کر دیجئے۔ ڈرننگول صاحب نے پھر اپنی اقتصادی مشکلات کا ذکر اور اپنی بیگم صاحبہ سے رحم کی اپیل کی مگر وہ تو گویا اس اخبار کی خریداری کے لئے بالکل ہی طے کئے بیٹھی تھیں آخر جمل کر بولیں کہ میں اپنے ناشتہ سے ایک آدمی چیز کم کر سکتی ہوں۔ اپنے لباس میں سے ایک آدھ چیز چھوڑ سکتی ہوں۔ اپنا بولنے والا اخبار بند کر سکتی ہوں مگر اس میز والے شیشہ کے اخبار کو ضرور خریدوں گی۔ میری جوشت آئی تو میں نے کہہ دیا کہ صاحب آپ کو اختیار ہے آپ جو چاہے کریں مگر اس بولنے والے اخبار کو نہ بند کرائیں۔ بس جناب وہ نیک بخت مجھ پر برس پڑی کہ آپ کیا جانیں اور آپ کو کیا معلوم کہ مجھ کو اس اخبار کا کس قدر شوق ہے اور اگر میرا یہ شوق پورا نہ ہوا تو میرا وزن کس قدر کم ہو جائے گا اور مجھ کو کس شدت کے ساتھ نزلہ ہو جائے گا۔ آپ ایک دوسری دنیا کے رہنے والے آپ ہمارے معاملات میں کیوں دخل دے رہے ہیں۔ محض آپ کے

مرحج کا سیر

دخا دینے کی درجہ سے نمہ کو اتنی سی در میں تین مرتبہ چھینکیں آچکی ہیں۔ مسز نزلنگول کے اس عرصہ سے زیادہ میں اس بات پر حیران ہوں کہ آخر اس شوق کے پورا نہ ہونے سے ان کو شدت کے ساتھ نزلہ کیوں شروع ہو جائیگا۔ اور میرے دخل در معقولات پر ان کو تین مرتبہ چھینکیں کیوں آئیں۔ بہر حال ان باتوں پر غور کرنے سے پہلے میں نے مسز نزلنگول سے معافی مانگی اور اپنے الفاظ واپس لئے یہاں تک کہ جب وہ اپنے شوہر کی طرف دنیا سے منہ پھیر کر گرجے لگیں تو میری جان میں جان آئی۔ آخر کار اس عہد نے اپنے شوہر سے وعدہ لے ہی لیا کہ میز والا شیشہ کا اخبار آجائے گا۔ اور اس غریب نے کئی اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ چپکے سے راضی ہو گیا۔ مختصر یہ کہ معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں دنیا اور مرحج دونوں جگہ کے مردوں کے لئے سعادت مندی بہت ضروری چیز ہے۔ خیر صاحب خد اخذ کر کے یہ طوفان ختم ہوا۔ اور قیامت نے دم لیا۔ بلکہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب مسز نزلنگول تشریف لے گئیں تو نزلنگول صاحب نے نہایت عاجزی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ میں نے اگر ان کی بیوی کی باتوں کا کوئی تاگوار اثر لیا ہو تو معاف کر دوں۔ میں نے اس کے جواب میں ان سے کہا کہ جناب والا اس معاملہ میں مجھ کو آپ سے روٹھنے کی کجائش تو اس وقت ہو سکتی تھی جب میں تنہا آیا ہوتا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ میں بھی اپنے ساتھ بیوی کو لایا ہوں۔ اور ہر وقت اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی دن آپ کو نہ ڈانٹ دیں۔ بہر حال اگر کبھی اس کی نوبت آئے تو آپ میری ہی طرح فراخ دلی سے کام لے کر کوئی

مریج کی سیر

اثر نتیجے کا۔ ڈرنگول صاحب جسنے لگے اور ان کی ہر ہنسی کے زور میں م پھر پھڑپھڑانے لگی۔ آخر میں نے ذرا نرم آواز کے ساتھ پوچھا کہ کم سے کم یہ بتا دیجیے کہ مسز ڈرنگول نے اپنے اس شوق کے پورا نہ ہونے کی صورت میں نزلہ کے امکان اور میرے دخل درمہتولات پر چھینکوں کا ذکر کیوں کیا تھا۔ ڈرنگول صاحب نے بے پروائی سے کہا کہ بات یہ ہے کہ وہ خود اہر بات کا اثر اپنے دماغ پر لیتی ہیں اور ان کو نزلہ یا پھیپھیں کیا بڑے سے بڑا دماغی مرض پیدا ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہماری دنیا میں تو دل پر اثر لیا جاتا ہے۔ ڈرنگول صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ معاف کیجئے گا آپ کی دنیا میں تو ہر بات اٹھی ہی ہوتی یا شاید وہاں دماغ سینے میں اور دل کھوپڑی میں ہوتا ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی تردید کروں مگر چونکہ ثابت کرنا ذرا مشکل تھا لہذا صرف سر کھجا کر رہ گیا۔

آج میری گھڑی میں جون ۱۹۵۲ء کی دوسری تاریخ ہے اور میں سخت پریشان ہوں اس لئے کہ میں ایک عجیب و غریب حادثہ کا شکار ہو کر سخت بمرح ہو گیا ہوں۔ چوٹ کی تکلیف الگ ہے اور مریج کا طریقہ، علاج علیحدہ تاک میں دم کئے ہوئے ہے۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ پچیسوں رات کو موسم کچھ ایسا تھا کہ بے اختیار نہانے کو دل چاہا اور اس بے ساختہ خوشی نے ایسا بدحواس کیا کہ اپنا مریج میں ہوتا بھول گئیں نے جو ایک جست شفاف پانی کی لہروں میں لگائی تو آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا، دماغ چکر کھا گیا اور ہڈی اسپلی چکنا چور ہو کر راہ گئی پہلے تو میں اُف کر کے دم بخود ہو گیا

مرخ کی میر

اس کے بعد جب ہوش میں آیا تو میری یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ اتنے دن مرخ میں رہتے ہوئے ہو گئے، لیکن آج تک میں یہاں کی خشکی اور تری کا فرق نہیں سمجھ سکا اور جسے میں نے شفاف پانی کا چشمہ خیال کر کے جست لگائی تھی وہ نہایت سخت قسم کی زمین تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹانگ الگ ٹوٹی اور دانت الگ غائب ہوئے یہ سب تو گویا شدید چوٹیں ہیں رہ گئیں خفیف ضرب میں وہ تو متعارف آئی ہوں گی اور خود ہی ٹھیک بھی ہو گئی ہوں گی۔ خیر یہ تو ایک اتفاقی حادثہ ہے جس کا تعلق براہ راست اپنی ذاتی حماقت سے ہے مگر یہاں اب جو تیاریاں اور تیمارداریاں ہو رہی ہیں خدا ان سے دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ یہاں سب سے بڑے رعنائت فرما جناب ڈرنگول ہیں چنانچہ ان کو جیسے ہی اس حادثہ کی خبر ہوئی فوراً ایک کلھاڑی نامہ ہتھیار لے کر دوڑے اور بغیر مشورہ کئے میری اس ٹانگ کو کاٹ دینے کا ارادہ فرمایا جس میں چوٹ آئی تھی مگر میں نے گھبرا کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ان کو میرے اس سوال پر سخت حیرت ہوئی اور میری طرف گھور کر کہنے لگے ”اسی پیر میں چوٹ آئی ہے نا؟“ میں نے کہا کہ ”ہاں چوٹ تو اسی پیر میں ہے مگر یہ کلھاڑی؟“ وہ میری بات کاٹ کر کہنے لگے کہ ”صاحب! اس کو فوراً کٹوائیے ورنہ اس سے تو آپ کا تمام جسم سڑ جائے گا اور پھر اس کا علاج بھی نہ ہو سکے گا۔“ میں نے اپنا پیر باوجود درد کے سمیٹتے ہوئے کہا کہ ”معاف فرمائیے جناب میرا جسم بھی کوئی مچھلی کا ہے جو سڑ جائے،“ کہنے لگے ”جناب آپ کا جسم

مریج کی میر

جھلی کا ہوا کچھوے کا مگر مریج کی آب دہوا کا اثر یہ ہے کہ چوٹ والا حصہ اگر فوراً کٹوانا دیا جائے تو پورا بدن فوراً سڑ جاتا ہے، پیر کٹوائیے، میرا کہنا مانئے ورنہ مجھے بھی افسوس ہوگا اور آپ بھی پشیمان ہوں گے۔ میں اس کے جواب میں خدا جانے کیا کہنے والا تھا کہ مسز زرننگول کی عورت یعنی مسز زرننگول بھی آپنوں نہیں اور آتے ہی اپنے شوہر نام دار سے پوچھا کہ کاٹ دیا ان کا پیر؟ ”زرننگول صاحب نے جریز ہو کر کہا کہ، ”نہیں صاحب یہ نیا کے لوگ عقل کے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بھلائی کر رہا ہوں اور ان کا پیر کاٹنا چاہتا ہوں مگر یہ ہیں کہ مجھ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔“ میں نے جلدی سے کراہتے ہوئے کہا کہ، ”نہیں صاحب یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ قصہ دراصل یہ ہے کہ آپ میرا صحیح علاج نہیں کرتے ہیں۔ آپ مجھ کو اسپتال لے کر چلیں وہاں ڈاکٹر جو کچھ کہے گا مجھ کو اس میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ مسز زرننگول نے یہ سنتے ہی ایسا حقاہ قہقہہ لگا یا کہ میں اپنا درد بھی بھول گیا اور ان کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ برابر نہایت خوفناک ہنسی ہنس رہی تھیں اور ان کی دم تو گویا پچھاڑیں کھا رہی تھی مجھ کو تعجب سے سوالیہ نشان بنا ہوا دیکھ کر زرننگول صاحب نے کہا کہ واقعی ہنسی کی بات ہے کہ چوٹ کا علاج آپ اسپتال میں کرانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی گویا جھوٹ بولنے، چوری کرنے، جھٹلی کہانے یا بے ایمانی کرنے کی کوئی عادت ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ان حضرت کے بیان سے میرا تعجب دور ہو جائے گا۔ مگر ان کے بیان سے تو اور بھی حیرت ہوئی کہ یہاں کے اسپتالوں میں

مریخ کی سیر

امراض کا نہیں بلکہ بری عادتوں کا علاج ہوتا ہے مگر اس سے قبل کہ میں ان سے کچھ دریافت کروں زرننگول نے مجھ سے دریافت کیا کہ دنیا کے ڈاکٹر ٹوٹی ہوئی ٹانگوں اور دانتوں کا علاج کرتے ہیں۔ میں نے ایک آہ کے ساتھ حامی بھری۔ زرننگول نے کہا کہ مریخ میں اس قسم کی تشکاتوں کا علاج یہاں کے ماہر بڑھئی انجام دیتے ہیں مسز زرننگول کی بے محل ہنسی پر مجھے سخت قسم کا غصہ آ رہا تھا لیکن زرننگول مرد ہونے کی بنا پر ذرا اعلیٰ قسم کا جانور ہے لہذا اس نے انسانی اخلاق کے ساتھ کہا کہ بھائی بات یہ ہے کہ ہمارے مریخ میں اس قسم کی ٹوٹ پھوٹ کا کام ڈاکٹروں سے متعلق نہیں ہوتے اور ذیہ مرمت اسپتالوں میں ہوتی ہے بلکہ اس کے لئے تو فیکٹریاں اور کارخانے کھلے ہوئے ہیں جہاں بڑے بڑے ماہر بڑھئی یہ خدمات انجام دیتے ہیں، رہ گئے ڈاکٹر، وہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی علاج میں مہارت رکھتے ہیں۔ کیا آپ کی دنیا میں ان بڑھئی قسم کے کاریگروں کو ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔ جب ہی آپ اس طرح حیرت سے منہ کھولے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ صاحب بات تو یہی ہے مجھ کو سخت حیرت ہو رہی ہے اور میری زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ میں کسی ڈاکٹر کے متعلق یہ سنوں کہ وہ بڑھئی ہوتا ہے مگر خیر میں اس وقت ڈاکٹر اور بڑھئی کا فرق معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا اس لئے کہ مکلفیت کی وجہ سے میرا دم نکلا جاتا ہے، مجھ کو آپ فوراً کسی بڑھئی کے پاس لے چلیں حالانکہ میں شیٹم یا دیو دار کا بنا ہوا نہیں بلکہ گوشت پوست اور ہڈیوں کا بنا ہوا انسان ہوں۔ مسز زرننگول

مریح کی سیر

نے مد پھلا کر کہا کہ یہ کیا بات ہوئی میں نے جن کو اب دیا کہ آپ کو اس کے سمجھنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اس کو سمجھنے کے لئے جس قسم کی عقل کی ضرورت ہے وہ صرف دنیا کی آب و ہوا میں پائی جاتی ہے پھر میں نے سطر ڈرنگول سے گھبرا کر کہا کہ خدا کے لئے آپ مجھے جلد از جلد بقول خود کسی بڑھئی کے پاس لے چلئے۔ ڈرنگول صاحب نے کہا کہ جناب والا! میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر آپ اسی حالت میں کسی قابل بڑھئی کے یہاں گئے تو وہ آپ کو اور مجھ کو وہ نون کو بے وقوف بنائے گا اور ممکن ہے کہ اتنی دیر میں چوٹ اتنی پھیل جائے کہ ابھی تو صرف آپ کی ٹانگ ہی کاٹی جا رہی ہے اس کے بعد کہیں آپ کا نصف جسم ہی نہ کاٹ دینا پڑے میں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ خدا کے لئے ایسے کلمے زبان سے نہ نکالو۔ میرے نزدیک مرنا اس سے بہتر ہے۔

البتہ مجھ کو اب جلد کسی ڈاکٹر یا بڑے ماہر بڑھئی کے پاس لے چلو تاکہ میری تکلیف کچھ تو کم ہو۔ ڈرنگول نے میری درخواست پر اس کم نجات کھٹاڑی کو ایک طرف رکھ دیا اور اس کے بعد ایک اڑنے والی کرسی پر مجھے بٹھا کر ایک انسانی اعضاء کی مرمت کرنے والی ورکشاپ میں لے گئے۔ وہاں ایک بڑھئی موجود تھا۔ دو کان میں قسم قسم کے آلات موجود تھے۔ وہاں ایک حضرت بیٹھے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ حضرت میرا علاج کریں گے مگر میں چپ تھا اور درد کی جان لیوا تکلیف کے باوجود حیرت سے ایک ایک چیز کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں

مریج کی سیر

ژرننگول صاحب کی دُوم سے دم ملائے ہوئے میرے معالج صاحب
 تشریف لائے اور مجھ کو دیکھ کر مرتختانی زبان میں کہا کہ آپ کے جب چوٹ
 آگئی تھی تو آپ نے فوراً پیر کیوں نہ کٹوا دیا۔ اب تک تو میں صرف
 ژرننگول کو بے وقوف سمجھ رہا رہا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ یہاں سب
 ایسے ہی عقل کے دشمن بستے ہیں مگر کرتا تو کیا کرتا تکلیف کی وجہ سے ان
 معالج صاحب کو منہ چڑھا کر چپ ہو رہا۔ ان حضرت نے پہلے ٹھونک بجا کر
 میرا پیر دیکھا پھر ژرننگول صاحب سے کہنے لگے کہ دیکھو نیا میں نے، بن
 جائے گا، مگر دو تین دن لگیں گے۔ ژرننگول صاحب نے کہا کہ دو تین
 دن تو بہت ہوئے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان بیچارے کے دنیوی
 حساب سے یہ مہینوں کا قصہ ہے۔ معالج نے اپنی دم اٹھا کر کہا کہ خبر دینی
 ہے اس لئے کہ اگر دم لگانے کا معاملہ ہوتا میں ابھی دم لگا دیتا۔ میرے
 یہاں ہر ساڑھ ہر ڈرائن اور ہر قسم کی دسین کثرت سے موجود ہیں مگر
 یہ ہے یہ خاص طور پر اس کے لئے پہلے تو سا پچھو بنا پڑے گا اس کے
 بعد لکڑی کو گوشت بنانے میں کافی عرصہ لگتا ہے اور وہ گوشت بھی
 دنیا والوں کے گوشت کی طرح کا ہوگا اور نہ مریجی باشندوں کے لئے
 جو گوشت استعمال ہوتا ہے وہ تو میرے پاس منوں موجود ہے۔
 ژرننگول صاحب نے کہا کہ آخر اتنے دن یہ بیچارے کس طرح رہیں گے
 ان کو سخت تکلیف ہے۔ اس کے جواب میں بڑھئی نے مجھ سے پوچھا
 کہ کہنے تو آپ کے دم لگا دوں، نہایت مضبوط بھی ہے گی اور خوبصورت

مریخ کی میر

بھی! میں نے گڑبڑ کر جلدی سے کہا کہ نہیں جناب میں لنڈورا ہی بھلا دم آپ کو
 مبارک رہے۔ معالج صاحب نے غور و فکر کے لئے اپنی دم سمیٹتے ہوئے کہا۔
 پھر آخر کیا کیا جائے۔ ڈرنگول صاحب نے کہا کہ ان کو صرف اپنے درد کا
 خیال ہے اگر وہ کسی صورت سے دور ہو جائے تو یہ مطمئن ہو جائیں گے۔
 معالج نے فوراً جواب دیا کہ بس اتنی سی بات ہے۔ اس کا علاج تو ابھی
 ہو جائے گا۔ میں ابھی ان کی ٹانگ کاٹے لیتا ہوں اور جو خراب حصہ ہے
 اس کو نکالے دیتا ہوں۔ آپ ان کی ٹانگ میں چھوٹے جامیے میں کوشش
 کروں گا کہ جس قدر جلد ممکن ہو مرمت ہو جائے لیکن اگر ٹانگ بالکل بدلنا
 پڑی تو واقعی عرصہ لگے گا۔ میں نے ٹانگ کاٹنے کے خیال سے گھبرا کر کہا کہ
 صاحب اس میں تو اور بھی تکلیف ہوگی۔ معالج نے تعجب سے پوچھا کہ اس
 میں تکلیف کی کیا بات ہے؟ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور معلوم نہیں
 کیا غیر محسوس حرکت کی کہ اب جو دیکھنا ہوں تو میں اپنی جگہ پر تھا اور میری
 ٹانگ معالج کے ہاتھ میں تھی نہ ٹانگ کاٹنے کا درد ہوا نہ خون بہا البتہ
 کچھ ہلکا ضرور ہو گیا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ کسی ریاضی کے ماہر نے
 مجھ میں سے اچھ گھٹا کر مجھ کو پہنچا بنا دیا ہے۔ میں نے تعجب سے کہا کہ اس
 یعنی کٹ گئی ٹانگ؟ ڈرنگول صاحب نے ہنس کر جواب دیا اور نہیں تو کیا
 پہاڑ کا کھودنا تھا یا ترکاری کا ٹنا تھی۔ معالج نے میری ٹانگ کو گھما
 پھر کر دیکھنے کے بعد کہا کہ آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ نئی ٹانگ نہ
 بنا نا پڑے گی بلکہ اسی میں کاٹ پیٹ کر مرمت ہو جائے گی۔ یہ ٹانگ ابھی

مریج کی سیر

مضبوط ہے البتہ اس کو چھوڑ جائیے تاکہ میں کارڈیگر کو دے دوں۔ معالج کے اس اطمینان دلانے سے یکسوئی تو ضرور ہو گئی مگر سوال یہ تھا کہ اس عرصہ میں چلیں پھر میں کیونکر فالٹنگول صاحب میرا مطلب سمجھ گئے اور اس سے پہلے کہ میں معالج سے کموں انھوں نے خود ہی کہا کہ ان کو فکر یہ ہے کہ اس عرصہ میں چلیں پھر میں گے کیونکر معالج نے کہا کہ اس مریج میں ان ٹانگوں سے چلنا تو یوں بھی مشکل ہے بہر حال اگر کئے تو دوسری ٹانگ بھی نکال کر عارضی طور پر دم لگا دوں۔ پھر جب ٹانگ درست ہو جائے گی تو دم واپس کر دیجئے گا۔ ممکن ہے کہ معالج نے ازراہ ہمدردی یہ کہا ہو مگر میں کیا کروں کہ مجھ کو دم لگوانے کے خیال سے ہی شرم آتی تھی اور یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ جو دم کی کسر تھی وہ بھی آج پوری ہو رہی ہے۔ مجھ کو ایک ٹانگ سے اچکنا گوڑہ تھا مگر دم کی طرف طبیعت مائل نہ ہوتی تھی مگر ڈرنگول صاحب کے اصرار نے مجبور کر دیا اور آخر میں نے اپنی دوسری ٹانگ بھی کٹوا دی۔ اب میں بالکل پیروٹ یا ہوا معلوم ہوتا تھا اور میز پر رکھا ہوا تھا مگر تھوڑی ہی دیر میں اس بڑھئی نے ایک چکرا دم میرے فٹ کر دی اور مجھ سے کہا کہ اترو میز کے اوپر سے میں نے ہاتھوں کی مدد سے اترنا چاہا مگر میرے معالج نے مجھ کو روک دیا اور کہا کہ دم پر زور دو مجھے یہ ڈ معلوم ہوتا تھا کہ کہیں اوندھے منہ پھر نہ گروں اور اب تک تو دونوں کا ٹوٹنا خیر چھپا پایا ہے۔ اب کہیں یہ راز نہ کھل جائے اور جس طرح میری ٹانگ مرمت کے لئے کارخانہ میں رکھی گئی ہے اسی طرح کہیں منہ

مرخ کی سیر

بھی نہ رکھ لیا جائے۔ مگر معالج کے کہنے سے میں نے دم پر زور جو دیا تو معلوم ہوا کہ دم خود بخود ٹیچہ کو چلا رہی ہے اور میں چل کر ہا ہوں گویا تیر رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ دم ذرا بد صورت چیز ہے اور اس میں مذاق کا ایک پہلو نکلتا ہے ورنہ یہاں چلنے پھرنے کے لئے ٹانگوں سے زیادہ مفید ہے۔ بہر حال مجھ کو دم کے سہارے چلتا دیکھ کر نہ تو معالج کو تعجب ہوا نہ ڈرنگول صاحب کو، البتہ جب میں گھر پہنچا تو بیگم نے دیکھتے ہی ایک بار سی کہا کہ اے ہے یہ کیا ہوا؟ میں نے اُن کو اس حادثہ کی تفصیل سنائی اس لئے کہ حادثہ کے وقت وہ اڑنے والی چھتری لگا کر سیر کر رہی تھیں اور اب مجھ کو دم دار دیکھ کر یہ سمجھ سکتی تھیں کہ ڈرنگول کی صحبت میں اُن کا شوہر بھی ہاتھ سے گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تھوڑی سی بہت حیرت کے بعد یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی اور اب وہ مجھ کو ہر زاویہ سے دیکھ دیکھ کر سننے لگیں مگر مجھ کو ان کی ہنسی میں کچھ لطف نہ آیا اس لئے کہ منہ کے اندر دانت اب تک مرمت طلب پڑے ہیں اور اُن میں درد ہے

آج جون شہداء کی سولہ تاریخ ہے اور میری واپسی کے انتظامات ہو رہے ہیں بچے کالج سے آگئے ہیں اور تمام سامان درست کرنے میں مصروف ہیں۔ بیگم بھی اپنے گھر جانے کے شوق میں اور مجھ کو کمزور سمجھ کر بہ کام میں ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ حالانکہ اب میں نہ کمزور ہوں نہ میرے دم لگی ہوئی ہے بلکہ اب تو میری ٹانگ مرمت کے بعد بالکل اصلی حالت میں واپس آگئی ہے

مریج کی میر

اور میں اچھا خاصا انسان معلوم ہوتا ہوں۔ کسی اور کو تو کیا خود مجھ کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ایسی سخت چوٹ آئی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مریج کی زمین پر چند دن دم لگا کر چلنے پھرنے کے بعد اب میں اپنی اصلی ٹانگوں سے بالکل اس طرح چل رہا ہوں جس طرح بچے چلنا سیکھتے ہیں اور ان کی لٹکھڑائی ہوئی چال پر ان کی مائیں دلار سے مثلاً تٹلا کر کہتی ہیں میوں میوں مگر اس خیال سے یہ تو ہونے سے رہا کر میں اپنی ٹانگیں اٹھا کر طاق پر رکھوں اور مستقل طور پر دم لگائے پھروں اخیر اس مریج میں تو اتنے دن بھی دم لگی رہی اگر دنیا میں ہوتے تو جس طرف سے نکل جاتے لڑکے تالیوں پر اڑاتے اور ”ڈیل میں دم لگی ہے“ کا شور دم کے ساتھ ساتھ ہوتا پھر بھی میرا ارادہ یہ ہے کہ اس دم کو واپس نہ کروں بلکہ اپنے ساتھ اس حادثہ کی یادگار کے طور پر لیتا چلوں اور جس وقت دنیا کے اخباروں میں اپنے مریج کے سفر کے حالات لکھوں، ان میں اس دم کی تصویر بھی پیش کروں اور اپنی وہ تصویر۔ ان حالات کے ساتھ ہی ساتھ شایع کراؤں جو دم لگنے کے بعد ڈرنگول صاحب نے کھینچی تھی۔ بہر حال میں نے بیگم سے خاص طور پر اس دم کو احتیاط سے رکھنے کی ہدایت کر دی ہے حالانکہ ان کو اس دم سے خدا جانے کیوں نفرت ہے اور وہ اس کو دیکھتے ہی نہایت برا منہ بناتی ہیں مگر میرے سوٹ کیمس میں رکھ دیا۔ ڈرنگول صاحب کو میرے جانے کا بہت افسوس ہے اور وہ کچھ مرجھائے ہوئے سے نظر آ رہے ہیں۔ مسز ڈرنگول کو نہ ہم لوگوں کے آنے کی خوشی تھی نہ ہم لوگوں کے جانے کا غم ہے۔ البتہ ان کو برا

مریخ کی میر

یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہم لوگوں کے لئے ان کو تین دن کے ناشتہ کا انتظام کرنا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی اگلا وقت تو ہے نہیں کہ پورا اٹھن کیر پر ابھرا جائے اور اس کو ایک اچھے خاصے بستر کی طرح لادینے لادے پھرئے۔ اب تو تین دن کا ناشتہ کیا معنی ایک مہینے کی خوراک ایک دیاسلانی کی ڈبیہ میں کھکر جیب میں رکھی جاسکتی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ڈرننگول صاحب نے یہ کہہ دیا ہے کہ ان مخصوص کھانے کی گولیوں کے بجائے جو بازار میں بکتی ہیں چند خاص خاص مرئی کھانے ناشتہ میں ضرور دکھائے جائیں۔ مثلاً وہ شکار جو بندوق میں سالہ بھر کر کیا جاتا ہے اور پھر اس کو پکانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ پلاؤ جس کا صرف ایک چاول کھا کر پیٹ بھر جاتا ہے اور وہ مکھن ٹوسٹ جس کو ایک مرتبہ کھا کر ایک مہینے تک بھوک نہیں لگتی اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کھانا کھایا ہے سب سے پہلے مسٹر ڈرننگول نے اپنی محنت بچانے کے لئے یہی کہا کہ ناشتہ کی ضرورت ہی کیا ہے یہی ٹوسٹ کھلا کر سب کو روانہ کر دیا جائے مگر ڈرننگول صاحب نہ مانے اور اپنی بیوی کو ناشتہ کی تیاری میں مصروف کر دیا۔ ادھر میں آرام کر سی پر لیٹا ہوا ابھی غور کر رہا ہوں کہ مریخ سے آخر کیا کیا چیزیں لے چلوں پوں تو یہاں کی ہر چیز عجیب و غریب ہے اور لے جانے کو پورا مریخ لے جانا چاہئے مگر میں محض اسی قدر چیزیں لے جانا چاہتا ہوں جو راکٹ میں آجائیں چنانچہ سب سے پہلے ڈرننگول صاحب سے کہا کہ آپ مجھے وہ اخبار پڑھنے والی انگوٹھی منگا دیں جو مسٹر ڈرننگول کے پاس ہے۔ ڈرننگول صاحب نے کہا کہ یہ انگوٹھی آپ

مرچ کی سیر

کے لئے اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ آپ کے پاس وہ اخبار بھی نہ ہوں جن کے لئے وہ انگوٹھی بنائی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اس اخبار کا کوئی پرانا پرچہ لیتا جاؤں گا۔ مجھ کو تو صرف اپنی دنیا کے لوگوں کو یہ عجیب و غریب انگوٹھی دکھانا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ میرا مقصد نہیں ہے۔ ڈرنگول صاحب نے کہا کہ جناب والا آپ کو یہ انگوٹھی مل ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ یہ تو اخبار کے مستقل خریداروں کو دی جاتی ہے کوئی بازار میں بکنے والی چیز تو بے نہیں کہ میں منگادوں اور آپ لے جائیں۔ میں نے کہا کہ میں اخبار کا سالانہ چندہ داخل کئے دیتا ہوں۔ یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ اخبار بھی جاتا رہے گا اور آپ کی اس دنیا کے حالات بھی معلوم ہوتے رہیں گے۔ ڈرنگول صاحب نے پہلے تو اپنی دم سمیٹ کر کچھ غور کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد کایک اپنی دم پھلکا کر کچھ تھوڑا سا اُچکے اور تالی بجا کر کہنے لگے کہ ایک بڑی عمدہ ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ اس اخبار کے دینیوی نمائندہ کیوں نہ بن جائیں میں ابھی اخبار کے ایڈیٹر کو ٹیلیفون کرتا ہوں۔ وہ یقیناً اس کو فوراً منظور کر لیں گے اور اچھی خاصی رقم بھی ملے گی۔ مجھ کو بھی اس رائے سے اتفاق تھا۔ چنانچہ فوراً ٹیلیفون کیا گیا اور اس انگوٹھی والے اخبار کے ایڈیٹر نے اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ میں چاہتا تھا صرف انگوٹھی مگر اس اخبار کی طرف سے انگوٹھی تو خیر مل ہی گئی اس کے علاوہ ایک ایسا معاوضہ بھی نامہ نگاری کے سلسلے میں ملے ہو گیا کہ جو ہماری دنیا میں

مریج کی سیر

نامہ نگاروں کو کیا معنی ایڈیٹروں کو بھی نہیں ملتا۔ میں نے ڈرننگول صاحب کا شکر یہ ادا کیا اور ان سے کہا کہ اب تو مجھ کو آپ سے دو تین چیزیں اور بھی مانگنے کا حق ہو گیا۔ ڈرننگول صاحب نے کہا کہ وہ بھی فرما دیجئے شاید ان کے سلسلہ میں بھی آپ کا کوئی فائدہ ہو جائے میں نے کہا کہ خیر اب تو فائدہ کی کوئی امید نہیں ہے البتہ ان چیزوں کا مل جانا ہی میرے لئے بہت بڑی بات ہو گی۔ ڈرننگول صاحب نے بڑے اخلاق سے اپنی دم ہلا کر کہا کہ خیر آپ کہیں تو فائدہ کی صورتیں ہوں تو میرا کام ہے۔ میں نے کہا کہ مجھ کو ریڈیم کے چھاپے کی کوئی کتاب منگا دیجئے جس کو میں رات کے اندھیرے میں پڑھا کروں۔ ڈرننگول صاحب یہ سنتے ہی پہلے تو کچھ چپ ہو گئے اس کے بعد آپ نے پھر اپنی دم کو جنبش دی اور کہنے لگے کہ

ڈراڑھی ڈیاغ غزغز

غزوں ڈینغ غزناں غزنا

یہ مریجی زبان کا ایک شعر ہے جس کے معنی یہ ہوتے کہ

مانونا مانو جان جہاں اختیا ہے

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

میں نے کہا کہ آخر کچھ کہئے تو آپ نے تو شاعری میں گفتگو شروع

کر دی۔ میں تو اس شعر کو اس موقع پر سمجھ ہی نہیں سکتا۔۔۔۔۔ کہ آپ

تو ترکیب بتانے میں بھی دیر کر رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ آپ فوراً یہاں کے

مریخ کی سیر

مشہور پبلشرز زمان کوٹلیفون کہتے اور ان سے کہئے کہ میں ایک دنیا کا باشندہ ہوں۔ مریخ کی سیاحت کے بعد دنیا کو واپس جا رہا ہوں اور وہاں جا کر سفرنامہ لکھنے کا ارادہ ہے۔ اگر اسے آپ شائع کرنا چاہیں تو معلماً طے کر لیں۔ اگر مژدگان نے یہ سفرنامہ شائع کیا تو ریڈیم کے چھاپے سے یہ کتاب چھپے گی۔ اور دام بھی اچھے مل جائیں گے۔ میں نے فوراً مژدگان سے ٹیلیفون کا سلسلہ ملا کر معاملات پر گفتگو کی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں تمام معاملات اس حد تک طے ہو گئے کہ مجھے ٹیلیفون چھوڑے ہوئے ابھی مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ اس کمپنی کا چیپرائسز اپنی تمام کتابوں کی ایک ایک جلد اور سفرنامہ کی اجرت رقم پیشگی لے کر آگیا۔ یہ رقم میرے لئے تعجب انگیز تھی اس لئے کہ ہماری دنیا میں مصنفوں کو پبلشر جو رقم دیتے ہیں اس کے حساب سے یہ رقم دس گنی زیادہ تھی۔ بہر حال میں نے ڈرننگول صاحب کا شکر یہ ادا کیا کہ ان کی وجہ سے میں مریخ سے نہایت امیر ہو کر واپس ہو رہا تھا۔ ڈرننگول صاحب نے اس شکر یہ کے جواب میں کہا کہ خیر اب تک تو آپ سے اپنی مرضی کی چیزیں بتائی ہیں۔ اب میں تحفہ کے طور پر چند چیزیں آپ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سب سے پہلے اس چشمہ کو قبول کیجئے جو رات کو دن بنا دیتا ہے۔ میں نے نہایت شکر یہ کے ساتھ وہ چشمہ لے لیا پھر ڈرننگول صاحب نے وہ ٹارچ دیا جس کو دکھاتے ہی خط بن جاتا ہے مگر میں نے اس کو لینے سے اس بنا و پر انکار کر دیا کہ اگر اس کی روشنی ادھر ادھر

مریچ کی سیر

پڑگئی تو داڑھی کے ساتھ موچھہ بلکہ کیا عجیب ہے کہ ابرو اور سر کے بال وغیرہ بھی صاف ہو جائیں۔ ژرننگول صاحب نے کہا کہ میں اس کے ساتھ ہی اڑھی نکالنے والا آئینہ بھی پیش کرتا ہوں۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ بچتے جناب اگر کس آئینہ کو کبھی بھولے سے بیگم نے یا کسی اور عورت نے دیکھ لیا تو مصیبت ہی آجائے گی ژرننگول صاحب ہنسنے لگے اور ان چیزوں کو علیحدہ رکھ کر کہنے لگے کہ اچھا تو اب آپ آرام کر سہ سے اٹھیں اس لئے کہ راکٹ تیار رکھنا ہے اور آپ کا سب سامان اس پر پہنچ چکا ہے۔ میں تو تیار تھا ہی فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور مسز ژرننگول سے ملنے ان کے کمرے کی طرف چلا۔ اور ژرننگول صاحب سے نہایت خلوص کے ساتھ ناک رگڑا کر اور مسز ژرننگول کو دور ہی سے سلام کر کے زخمت ہوا۔ ژرننگول سلئے، فچھہ کو راکٹ تک پہنچانے آیا اور آخر جب راکٹ روانہ ہوا ہے تو وہ بیچارہ در تک دم ہلاتا رہا۔

قوم

قوم کے اعتبار سے میں ذرا یوں ہی سا ہوں۔ یوں ہی سا کا مطلب یہ کہ ہمارے بزرگوں میں ایک، صاحب بندر بنچاٹے تھے، مگر اس فن کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ بڑے بڑے سداری ان کا نام لے کر ڈگڈگی اٹھایا کرتے تھے۔ اور عجیب صلاحیت خداوند کریم نے ان کو عطا فرمائی تھی کہ کیسا ہی بیوقوف سا بے وقوف بند کیوں نہ ہو وہ چار ہی دن میں اس کو ڈگڈگی اور لاٹھی کے اشارے بند ریاسے روکھنا دفت بجانا۔ آئینہ دکھانا اور پھر منڈھے پر بیٹھ کر ٹوپی پہننا سکھا دیتے تھے۔ اللہ بخشنے دادی جان کہا کرتی تھیں۔ کہ دور دور سے بندروالے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور وہ بندر جو بڑے نامی گرامی بندر والوں سے نہ سہہ سکیں ان بندروں کو تصور ہی ہی سی توجہ سے ہمارے یہ بزرگ سدھا دیا کرتے تھے۔ وہ تو کئے کہ کچھ نشہ کرتے تھے یہ بزرگ، ان کو چاندو وغیرہ سے شوق تھا۔ ورنہ ان کی کمائی سے تو اب تک سب مالالال ہوتے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ ایک آٹہ فی ناچ۔ اور دن بھر میں پچاس ساٹھ ناچ، گویا تین روپے روز

مریج کی سیر

کے رئیس تھے۔ مگر ساتھ ہی ٹھاٹھ بھی ان کا رسیانہ تھا۔ جو کما یا سب نشہ پانی میں اڑا دیا۔ مگر اللہ رمی وفادار بیوی کر جب میاں حکومت کے باغیوں میں سمجھے گئے اور چاند و خانہ کے ایک ہنگامہ میں پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا تو اس نیک بیوی نے روضہ نبیابی کا، دکھانا شروع کر دیا۔ اور کسی اپنے بیگانے کے ساتھ ہاتھ نہ پھیلا یا۔ داد میا جان مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ جنت یہ محترمہ چلا تھی دھوپ میں دوپہر کے وقت روضہ کی گٹھری پیٹھ پر لا کر اور مور کی دم کی جھاڑو نما ایک چیز لے کر روضہ نبیابی کا دیکھو یا نبی رسول اللہ کی صد اہلند کرتی تھیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دوپہر کا سناٹا لرز رہا ہے۔

رعب کا یہ عالم تھا کہ یہ صد اسنتے ہی عورتیں اپنے بچوں کو لپٹا لیتی تھیں۔ اور ایسی گھر والیاں جو تنہا ہوں دوڑ کر دروازے کی زنجیر لگا دیتی تھیں۔ کوئی کہتا کہ بچوں کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔ کسی کا اعتقاد تھا کہ مہر کاٹتے جھوٹے میں ڈال لیتی ہے۔ مگر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو دھند دیکھنے کی سعادت حاصل کرتے تھے اور وہ کتاب نہایت عقیدت سے دیکھتے تھے جس میں ہر صفحہ پر ایک نہ ایک واقعہ کی تصویر ہوتی تھی۔ مثلاً ملک الموت کی تصویر جن کے پچاس ہاتھ اول ہر ہاتھ میں کوئی نہ کوئی خوفناک ہتھیار کسی میں چاقو کسی میں تلوار کسی میں بھالا۔ کسی میں صاف آنکھیں نکالے۔ سر سپینا، لگانے بیٹھے ہیں۔ یا ہندی کی ایک جھاڑی کی تصویر جس کے متعلق وہ نہایت عبرت انگیز انداز سے فرمایا کرتی تھیں کہ یہ ہندی بی بی فاطمہ کی۔ شریفوں نے جھوڑی۔ ڈومن چارن نے پیروں میں لٹائی۔ ہندی کی لالی تھی۔ پھولوں کی

ایک تصویر تھی محض لوٹے کی، جی ہاں لوٹا یہی ٹوٹی والا لوٹا جس سے ہم آپ سب ہاتھ منہ دھوتے ہیں مگر آج تک کسی کو یہ خیال نہ پیدا ہوا ہوگا کہ لوٹے کی تصویر بھی کھنچو انیس جس وقت یہ لوٹے والا صفحہ آتا وہ نہایت فصاحت سے فرماتی تھیں ” یہ لوٹا امام حسین کا۔ کربلا میں قطرے قطرے کو ترسے قیامت میں قطرے قطرے کا حساب دینے کو لوٹے سے قطرے قطرے کا حساب رکھ کر پانی بسایا۔ کربلا میں پانی نہ پایا جنت میں کوثر بسایا۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی تقریباً بیس تصویریں تھیں اس کتاب میں جو اب تک ہمارے خاندان میں محفوظ ہے۔

بس یہ ذرا سی کھوٹے ہمارے خاندان میں چلی آ رہی ہے اور قوم کچھ اسی قسم کے بزرگوں کی وجہ سے ذرا کڑ بڑا سی ہو گئی ہے ورنہ بعد میں تو ہمارے خاندان نے بڑی ترقی کی۔ ہمارے دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کو ایک انگریز نے بندر پکڑنے پر نوکر رکھ لیا۔ یہ انگریز بندر پکڑ پکڑ کر ولایت بھجوا یا کرتا تھا۔ اور فی بندر دادا جان کو چار آنے دیا کرتا تھا کچھ دنوں کے بعد تو ایک بے بندر کاریٹ مقرر ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دادا جان ہر روز دس پندرہ بندر پکڑ لیا کرتے تھے یعنی دس پندرہ روپے پکڑ لیا کرتے تھے۔ آدمی تھے سو بھدو بوجھ کے کچھ ہی دنوں میں یہ ترکیب سمجھ میں آ گئی اور دوسرے عزیزوں کو بھی اس کام پر لگا دیا جو عزیز بندر پکڑ کر لائے آپ اس کو چار آنے فی بندر کے حساب سے ادا کر دیں اور انگریز سے ایک روپیہ فی بندر وصول

مرخ کا میسر

کریں۔ اب تو کبھی سو کی کبھی سو اور سو پے روز کی آمدنی ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس انگریز نے ان کو ٹھیکہ دے دیا اور خود وہ کلکتہ چلا گیا۔ داداجان کو اس کام میں اللہ نے اتنی ترقی دی کہ دو تین سال کے اندر وہ لکھتہ ہی ہو گئے۔ والد صاحب کو خاندانی مشغلہ سے علیحدہ رکھ کر تعلیم دلانا شروع کر دی۔ اور آخر کار ان کو گریجویٹ کرادیا۔ داداجان کے انتقال کے بعد والد صاحب نے بندروں کا کاروبار ترک کر دیا۔ اور مرغیوں اور انڈوں کی تجارت شروع کی۔ اللہ نے اس میں بھی برکت دی اور دولت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اور ہم ایک بہت بڑی ریاست کے مالک بنا دیئے گئے۔

بینک میں لاکھوں جمع ہیں — کوٹھیاں کرائے پر چلتی ہیں۔ سواری کے لئے موٹر ہے۔ رہتے بھی نہایت ٹھاٹھ سے ہیں۔ نوکر چاکر سب ہی کچھ ہیں۔ ہر سوسائٹی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، ایک یتیم خانہ کی کمیٹی نے ہم کو صدر منتخب کر لیا ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اسمبلی کے ممبر بھی ہو جائیں گے امید ہے کہ آئندہ سال تک خطاب بھی مل جائے گا۔ مگر کچھ نہ پوچھئے کہ اس وقت ہمارا کیا عالم ہے۔ جب کسی سرکاری کاغذ کے ہر خانہ میں کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے — نام — باپ کا نام — قوم — بس یہ خانہ نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس خانہ میں کیا لکھا کریں۔ خیر لکھنے کو تو مسلم لکھ دیا کرتے ہیں لیکن خود اپنے دل کو اطمینان نہیں ہوتا.... یہاں تک بھی غنیمت تھا مگر ایک فکر ہے شادی کی اور شادی جہاں ہم کرنا چاہتے ہیں وہ صاحبزادیوں تو ہر اعتبار سے نہایت

مریج کی سیر

مناسب ہیں۔ البتہ ان میں ایک عیب یہ ہے کہ ان کی قوم کچھ بے عیب سی ہے۔ اصل نسل کی شیخ زادی ہیں۔ اور شجرہ اب تک محفوظ ہے۔ ہمت نہیں ہوتی کہ ان کے یہاں پیغام بھیجا جائے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ ان کے علاوہ ہم کہیں اور شادی کر لیں۔ غالباً وہ چیز ہو گئی ہے جس کو محبت وغیرہ کہتے ہیں۔ ہمارے پیغمبر صاحب کا خیال یہ ہے کہ ہم کو نسبت بھیج دینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ آج ان سے اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔

پیغمبر صاحب کی رائے کے مطابق ہم نے ادھر تو نسبت بھیج دی ہے اور ادھر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان صاحبزادی سے اظہار جذبات بکلی کر دیں۔ بات یہ ہے کہ ہم دونوں مسوری آئے ہوئے ہیں۔ ہر روز کہیں نہ کہیں ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ ویسے تو نہایت خندہ پیشانی سے ملتی ہیں بلکہ گہمی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت سے مل رہی ہیں، ایک آٹھ مرتبہ پکنک پر بھی جا چکی ہیں۔ چنانچہ آج بھی ہم نے ان کو پکنک پر مدعو کیا تھا۔ تاکہ اظہار عقیدت کر ہی گزریں اور اگر ان کی طرف سے عقیدت کی حوصلہ افزائی کی جائے تو اس مجاز کو حقیقت بنا کر اظہار محبت بھی کر دیں۔ چنانچہ ہم ان کے انتظار میں باہر ٹھل رہے تھے اور اظہار جذبات کے لئے مناسب الفاظ جن جن کر دماغ میں محفوظ کرتے جاتے تھے۔ مثلاً ناہید ہم دونوں کی یہ عارضی یک جہتی اگر دوام حاصل کر لے، مگر شاید وہ ”دوام کو“ ”جس ام نہ عجزیے۔ آخر اٹھڑا کی ہی تو ہے معصوم نادان لہذا۔“ ناہید اگر ہمارا یہ ساتھ زندگی کا ساتھ بن جائے تو، مگر نہیں اس قدر صاف کہہ دیا تو

مرحج کی میر

مکن ہے کہ قہر طار دے۔ ہر چند کہ قہر طرد اتذیب سے گری ہوئی چیز ہے۔
مگر بہت ہی سادہ ہے وہ لڑکی۔ کیا عجب کہ سادگی میں یہ پرکاری کہ
بیٹھے لہذا ”ناہید جب تم ساتھ ہوتی ہو تو مجھے اپنی دنیا آباد سی نظر آتی
ہے۔ آخر یہ کیوں ہے؟“ لیکن اگر وہ پوچھ بیٹھی کہ آپ ہی بتائیے کہ یہ کیوں
ہے تو ہم کیا جواب دیں گے لہذا ابتدائی جملہ ایسا ہونا چاہیے جس کا جواب
ہم کو خود بھی بخوبی معلوم ہو۔

ہم کسی نتیجہ پر پہنچنے بھی نہ پائے کہ ناہید کی رکت آگئی۔ آج وہ اور
بھی قیامت تھی، بالکل بنفشہ کا پھول تاکہ ہماری محبت کا نزلہ بھی درست
ہو تا رہے۔ بالوں کی ترتیب میں بھی خاص سلیقہ سے کام لیا گیا تھا، اور
چہرے پر تازگی بھی آج ہر روز سے زیادہ تھی۔ ہم فوراً اس حماقت سے ہرمتنا
ہو گئے کہ شاید ہماری نسبت، پونج چلی ہے اور اس کی خبر ناہید کو بھی
ہو چکی ہے۔

اس نے بجلی کی طرح رکتہ سے اترتے ہوئے چمک کر کہا: ”اب چلے نا

آپ تو معلوم ہوتا ہے کہ وظیفہ بڑھ رہے ہیں“

ہم نے کہا: ”ارادہ یہ تھا کہ گھوڑے پر جائیں گے مگر آپ باندھ کر
آئی ہیں ساڑھی، یہی میں سوچ رہا تھا کہ عورتیں آخر ساڑھی کیوں باندھ لیا
کرتی ہیں کہ مردوں سے ایک ہی لباس بچا رہے۔ بہر حال اب یہ سفر
ڈانڈی پر یا پیدل ہو گا“ اور وہ آگے بڑھ گئی۔

ہم نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا: ”چلئے پیدل سہی۔ بھوک خوب لگے گی۔

مریج کا میر

اس نے کہا ” اور سامان وغیرہ “

” ہم نے کہا۔ سب جا چکا ہے “

آبادی سے نکل کر ہم دونوں ایک سنان گھاٹی میں خراماں تھے۔
کہ یکا یک ہم کو اظہار جذبات کا خیال آیا بہر طرف ہم نے نظر دوڑائی اور
اطمینان کر لیا کہ اگر جو ابانا ناہید مار بیٹی تو بھی دیکھنے والا کوئی نہ ہوگا اس
گلا صاف کر کے بہ مشکل تمام ہم نے کہا۔

” مجھ کو اس قسم کے مقامات بہت پسند ہیں “

اُس نے کہا ” مجھے اس چڑیا کی دُم بہت اچھی لگتی ہے۔ کاش میں

چڑیا ہی ہوتی “

ہم نے کہا ” پھر میں کیا کرتا “

اس نے غور سے ہم کو دیکھ کر کہا۔

” آپ جو چڑھی مارینا پسند کرتے آپ ؟ “

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا دم نہیں نکلا، حالانکہ ناہید کے اس چلے کے

صاف معنی یہ تھے کہ اس کو ہمارے خاندانی حالات کا علم ہو چکا تھا۔ ہم

سٹ پٹا کر رہ گئے تو اس نے پھر کہا ” یہی چڑھی مارینا آپ کو اتنا نا پسند

ہے کہ آپ چپ ہو گئے اچھا خیر جانے دیکھئے میں نے اپنا چڑیا بننا ملتوی

کر دیا ہے۔ فی الحال “

جان میں جان آئی اور ہم نے پھر ایک چشمے کے قریب پہنچ کر کہا۔

” معلوم ہوتا ہے جیسے محبت کا ایک ترانہ ہے جو مسلسل ہو گیا ہے “

مریخ کی سیار

اس نے غور سے ہم کو دیکھ کر کہا: ”بھئی، اللہ ایسی باتیں نہ کہئے، ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ شاعر نہ ہو جائیں۔“ ہم نے ذرا رومان طاری کرتے ہوئے کہا: ”ناہید کبھی تم سنجیدگی سے قدرت کے ان اشاروں پر غور کرتی ہو؟“

ناہید نے کہا: ”دو مرتبہ غور کیا ہے“

ہم نے کہا: ”کب؟“

اس نے کہا: ”ایک آٹھ جنوری ۱۹۳۳ء کو اور دوسری مرتبہ ۱۶ اگست

۱۹۳۳ء کو“

ہم نے حیران ہو کر کہا: ”کیا مطلب؟“

اس نے نہایت سادگی سے کہا: ”تاریخی حوالے دینے کے بعد مطلب

اب میں کیا بیان کروں؟“

ہم نے جزبہ ہو کر کہا: ”اے بھئی ان تاریخیوں میں کیا خاص

واقعات ہوئے تھے؟“

اس نے کہا: ”آٹھ جنوری کو میں نے قدرت کے اس اشارے پر غور

کیا تھا کہ دن کو سورج کیوں نکلتا ہے اور ۱۶ اگست ۱۹۳۳ء کو میں نے

قدرت کے اس اشارے پر غور کیا تھا کہ رات کو چاند کیوں طلوع ہوتا ہے؟

ہم نے ایک قہقہہ لگا کر کہا: ”برطانیہ شہریہ ہو اور اسی شرارت کا نام

ناہید ہے“

ناہید نے سنجیدگی سے کہا: ”آپ کی قدر میری نظر میں بس اسی لئے

ہے کہ مزاح لطیف کو فوراً سمجھ لیتے ہیں“

مریج کی سیر

ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ اس نے جھوٹ کہا ہے یا سچ کہہ رہی ہے لہذا ہم
سیٹی بجانے لگے۔

چشمے کے کنارے نہایت سرسبز و شاداب اور رومان آفریں جگہ ہمارے
نوکروں نے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ گراموفون بھی کھلا ہوا رکھا تھا۔ گویا ہم
یہاں صرف ریکارڈ بجانے آئے تھے۔ ناہید نے آتے ہی پہلے گراموفون کو
بند کیا اس کے بعد ہم دونوں نے چشمے کے پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور تھکن دور
کرنے کے لئے دونوں ذرا لیٹ گئے اس کے بعد کھانا کھایا اور اب وہ ضرور
کام باقی رہ گیا تھا جس کے لئے ہم یہاں آئے تھے۔ یعنی اظہار تہنیتا۔ لہذا ہم
دونوں چلے تو بالکل چوٹی پر چڑھ گئے اس کے بعد ہم نے پھر موقع ڈھونڈا ہلکا
”میرا کوئی خط پہنچا ہے۔ تمہارے یہاں“

”ناہید نے کہا۔“ جی ہاں“

ہم نے کہا۔ ”جی ہاں کے بعد بھی تو کچھ کہا ہوتا ہے“

ناہید نے کہا۔ ”اور کیا کہتی ہیں۔ آپ نے اتنا ہی تو پوچھا تھا دوسرے
یہ کہ تفصیلات سے شاید آپ کو تکلیف ہوتی۔ اباجان بے حد خفا ہوئے۔
ان کو پہلے تو سخت غصہ آیا۔ پھر بیکار ہو گیا وہ بے حد سنبھلے اور آخر میں وہ خط اٹھا
مجھ کو دے دیا۔“

ہم نے کہا۔ ”پھر اب کیا ہوگا۔ میں تمہارے اباجان کے غصہ اور مہنسی
دونوں سے ڈرتا ہوں“

ناہید نے کہا۔ ”مگر اب تو اباجان کے غصہ اور مہنسی کے علاوہ ان کی

مریج کی سیر

لڑکی سے بھی ڈرنا پڑے گا،

ہم گرتے گرتے بچے اور ہم نے ایک پتھر سے پھسلتے ہوئے کہا: کیا۔ کیا۔ کیا۔

ذرا پھر تو کمو۔

ناہید نے کہا: ”شاید تم واقعی بہت سادہ لوح ہو مجھ سے تم شادی کرنا چاہتے تھے تو اباجان کو خط کیوں لکھا۔ مجھ سے کیوں نہ کہا۔ حالانکہ تم کو مظلوم بتھا کہ میں تم کو ناپسند نہیں کرتی ہوں۔“

ہم نے بلدی سے کہا: ”یعنی پسند کرتی ہو۔ پھر تو۔ تو پھر۔“

ناہید نے کہا: ”پرسوں اتوا ہے نا۔ اباجان اسی دن ہم دونوں کی

شادی نہایت سادگی کے ساتھ کر دیں گے۔“

ہم نے لپک کر ناہید کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جھاڑی سے ایک لنگور نکل کر بھاگا اور

ہم اس سے آنکھ چرا گئے۔

شادی کے بعد ہی ہم دونوں کی تصویریں اکثر انگریزی اخباروں میں

نکلیں۔ شادی میں بڑے بڑے لوگ شریک ہونے پر سب کچھ ہوا مگر جس بات

سے ہمارا دل باغ ہو گیا تھا، وہ یہ ہے کہ ہمارا شجرہ کسی نے نہ مانگا اور نہ قوم

پوچھی۔ شادی کے بہت دن بعد ایک روز ہمارے خسر صاحب نے بیان کیا میاں

صاحبزادے ہم لوگ اپنے ذاتی مٹھار میں۔ ہم نے خون پسینہ ایک کر کے یہ

مرتبہ حاصل کیا ہے مجھ کو معلوم ہے کہ تم سلا رو بند رو الے کے پوتے ہو اور

تم کو شاید معلوم نہ ہو گا کہ ہمارا خاندان بھی تمھارے گاؤں سے قریب ہی

دوسرے گاؤں کا ہے۔ ہمارے یہاں کان کا میل نکالنے کا کام ہوتا تھا۔

مرحبا کی سیر

تم بندروالے اور ہم کن ملیے۔ مگر خدا ہم دونوں کا پردہ پوشش اور ہم سب سے
عالی خاندان اور ہماری قوم سو قوموں کی ایک قوم۔ ہم نے جلدی سے
ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی ملازم سن تو نہیں رہا ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ صرف
خوش دامن صاحبہ خود اپنے کان دیا سلامتی سے کرید رہی تھیں۔

شادی کی درخواست

بعض اوقات ذرا سی شرارت بہت بڑی سنجیدگی بن جاتی ہے۔ اور خدا نہ کرے کہ وہ سنجیدگی حادثہ کی صورت اختیار کر لے۔ مگر جب کسی کی شامت ہی آگئی ہو تو وہ سنجیدگی اور حادثہ دونوں سے خالی الذہن ہو کر شرارت کہہ ہی بیٹھتا ہے اور آپ جانتے ہیں، کہ مولوی محمد اسماعیل صاحب میرٹھی اسی قسم کے آدمی کے متعلق اپنی ایک ریڈ میں فرما گئے ہیں کہ

ایسے نادان سے مشکل ہے سلامت رہنا

ہو ایہ کہ ایک دن یوں ہی بیٹھے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے کہ بنگاہ ایک

اشتہار پر پڑ گئی۔

شادی کی ضرورت

ایک حسین و جمیل سلیقہ شعرا انٹرنس پاس شریف خاندان حنفی المذہب دو شیزہ کے لئے ایک ایسے برکی ضرورت ہے جو شریف خاندان تعلیم یافتہ جوان لڑکے اور برسر روزگار ہو شادی شدہ یا صاحب اولاد حضرت خط و کتابت نہ کریں۔

مریخ کا میر

ع۔ معرفت میجر صاحب روزنامہ خیر لاہور

اس قسم کے اشتہار اخبارات میں چھپا ہی کرتے ہیں۔ یہ کون سی نئی بات تھی، مگر معلوم نہیں ہم کو کیا سوچھی، کہ بیگم کو بلا کر اشتہار سناتے ہوئے کہا۔
”کتنے کیا کہتی ہیں آپ؟“

بیگم نے ہنس کر کہا: ”بھئیے ناخط۔ میں کیا روک رہی ہوں۔“
ہم نے کہا: ”سنا بھی کہ شادی شدہ یا صاحب اولاد حضرات خط و کتابت نہ کریں۔“

بیگم نے کہا: ”مگر کیا خبر ہوگی، کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے۔“
ہم نے کہا: ”اچھا لاؤ، ذرا میرا قلم، یہی لطیفہ سہی۔“
بیگم نے شیروانی کی جیب سے قلم نکالتے ہوئے کہا: ”لطیفہ نہیں سچ مچ پیغام دیجئے نا۔ کسی بے چارے شریف آدمی سے اس قسم کا مذاق کرنے سے کیا فائدہ؟“

ہم نے کہا: ”سچ مچ پیغام توخیر میں نے آپ کے یہاں بھی نہیں دیا تھا۔ مگر یہ تو دلچسپ مذاق رہے گا۔ میں اپنی تصویر بھی بھیجوں گا۔“
بیگم نے کہا: ”اور لڑکی کی تصویر خود منگاؤں گا، یہ بھی تو کہنے۔“
ہم نے ہنس کر کہا: ”اچھا یا، آگیا اپنا قصہ بے شک۔ منگاؤں گا لڑکی کی تصویر۔“
بیگم نے سنجیدگی سے کہا: ”بڑی بُری بات ہے۔ انسان اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھے۔“

ہم نے کہا۔ اجی لاول ولاقوۃ یہ سب اعتبارات ہیں اگر میں نے

مریخ کی سیر

تصویر منگالی، اور تصویر ابھی گئی میرے پاس تو اس سے واقعی کیا اثر پڑ سکتا ہے، لڑکی یا اس کی خاندانی مشرافت پر؟

بیگم نے کہا: ”لڑکی پر تو اثر نہیں پڑتا۔ مگر انسان کو خود اپنی مشرافت کا خیال تو کرنا چاہئے“

ہم نے کہا: ”اور فرض کر لیجئے کہ میں مشرفین نہیں ہوں تو؟“

بیگم نے منہ پھیرتے ہوئے کہا: ”تو پھر کچھ بھی نہیں، جو چاہے کیجئے“

ہم نے ایک پھول دار کاغذ پر ”ع معرفت روزنامہ میگزین خیر لاہور“ کے نام نہایت عبارت آرائی اور خوش خطی کے ساتھ اپنی پوری قابلیت صرف کر کے ایک ایسا خط لکھا۔ کہ اس خط کو پڑھ کر بڑے سے بڑا لڑکی والا بھی تا اطلاع ثانی ہم کو غلامی میں لینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ہم میں سوائے اس ایک عیب کے کہ بد قسمتی سے شادی ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں صاحب اولاد تک ہونے کے گنہگار ہو چکے ہیں اور کوئی ایسی خرابی نہیں ہے کہ کسی کو اپنی لڑکی لینے میں تامل ہو۔ لیکن اگر کسی کے سامنے ہم اپنی اس خامی کو چھپا کر پیش ہوں تو اس کو آپ خود ستانی نہ کہیں، بلکہ واقعہ یہی ہے۔ کہ بہت سے امیدواروں سے بہتر نکلیں گے۔ خدانے خاندانی طور پر مشرفین بنا ہی دیا ہے۔ تعلیم بھی آپ، کی دعا سے ہو ہی چکی ہے۔ برس برس روزگار تو ہیں ہی۔ لیکن اگر نہ بھی ہوتے، تو دال روٹی کھانے کے لئے گھر میں خدا کے فضل سے کوئی کمی نہیں ہے۔ رہ گئی صورت وہ بھی کم سے کم ایسی ہے کہ تصویر ہمیشہ اچھی آجاتی ہے۔ اور ہم خود اپنی ہر تصویر کو دیکھ کر حیران

مرحبا کی سیر

رہ جاتے ہیں۔ کہ یہ کیا ہماری تصویر ہے؟ اب آپ ہی بتائیے کہ اس زمانے میں جبکہ بقول لڑکی والوں کے لڑکوں کا کال پڑا ہوا ہے۔ ایسے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔ اور اگر ہم میں یہ خصوصیات نہ ہوتیں تو ظاہر ہے کہ جو شادی ہو چکی ہے وہی نہ ہو سکتی۔ لیکن اس شادی کے ہو جانے کے بعد کم سے کم یہ تو طے ہو گیا، کہ ہماری شادی ہو سکتی ہے اور ہم اس قابل ضرور ہیں کہ لڑکی والے اپنی نظر انتخاب کا مرکز ہم کو بنائیں۔ ہماری طرف تو یہ حقائق ہیں، اور سیکم غالباً اس معاملہ میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے ہمارے ساتھ شادی کر کے گویا ہماری پرورش کی ہے۔ ورنہ کہاں ہم اور کہاں شادی، یعنی اگر وہ شادی کرنے کے لئے اذراہ کرم آمادہ نہ ہو جاتیں۔ تو ہم جیسے کنوارے ہی تو رہ جاتے۔ سیکم کے اس معاملہ کو دور کرنا بحیثیت ایک خود دار شوہر کے ہمارا اولین فرض تھا، اور اس فرض کی ادائیگی کا بہترین موقعہ یہی تھا کہ اس اشتہار سے ہم فائدہ اٹھاتے، چنانچہ ہم نے خط لکھا۔ اور سیکم کو سن کر بنا کر دیا۔ حالانکہ وہ اب بھی اسی طرح ہنس رہی تھیں، کہ گویا ہماری شادی ہو ہی نہیں سکتی، خیر شادی تو ہم کو بھی کرنا نہ تھی۔ مگر شادی ہو سکتی ہے یا نہیں یہ بات ضرور ظاہر کرنا چاہتے تھے خط بھیجنے کے بعد، ایک روز اسی کا چرچا رہا، اور اسی خط کے سلسلہ میں معاصرانہ نوک جھونک کا سلسلہ ہم دونوں میں جاری رہا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ تذکرہ کچھ ختم سا ہو چلا۔ ایک دن ڈاک میں ہم کو اس خط کا جواب معہ نوٹوں کے وصول ہو گیا۔ یقین جانے

مریج گماہیر

کہ ہم اچھل پڑے کیا کسی امید دار کو ایسی خوشی ہوتی ہوگی، جو ہم کو اس وقت ہوئی تھی بیگم کی شکست کا کھلا ہوا اعتراض ان کے پندار باطل کو ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دینے والا پتھر اس وقت ہمارے قبضہ میں تھا۔ ہم بچوں کی طرح اچھلتے کودتے بیگم کے پاس پہنچے۔ اور ان کے ہاتھ سے کروٹیا اور میزبوش دونوں کو چھین کر ایک طرف اچھالتے ہوئے کہا:-

”یہ آگیا جو اب، کہنے اب آپ کیا کہتی ہیں؟“

”بیگم نے لفافے کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا:- ”دیکھوں“

”ہم نے لفافے کو مضبوط گرفت میں لے کر کہا: ”ابھی نہیں، پہلے ایک

مرتبہ ذرا یہ کہہ دیجئے، کہ میں نے آپ کی جو کھٹ پر ناک رگڑی تھی جو تیاں توڑی تھیں دوڑتے دوڑتے“

بیگم نے ڈھٹائی سے کہا:- ”یہ تو میں اب بھی کہتی ہوں اور نہیں تو

کیا میں خود ہاتھ جوڑتی ہوئی آگئی تھی“

ہم نے سرخروئی کے ساتھ لفافے سے خط نکالتے ہوئے کہا: ”اچھا تو اب“

بیگم نے ہاتھ بڑھا کر کہا:- ”یہ تصویر تو دیکھوں“

ہم نے ذرا مٹھتے ہوئے کہا:- ”نہیں، پہلے خط سنئے فرماتے ہیں ہمارے۔

— لاجل ولاقوۃ — یعنی لڑکی کے والد صاحب محترم کہ — جناب،

محترم اشتہار کے سلسلہ میں جناب والا کا گرامی نامہ مو تصویر کے موصول

ہوا اس اشتہار کو دیکھ کر بہت سے حضرات نے خطاطی کی ہے۔ مگر میں

سب سے پہلے آپ ہی کو جو یہ دے رہا ہوں۔“

مریج کی میر

ہم نے خط پڑھنا متوی کرتے ہوئے کہا: ”سن رہی ہیں آپ سب سے پہلے۔“

اور سب خطوط کو بیکار سمجھ کر،

بیگم نے کہا: ”اچھا اچھا، خوش بعد میں ہو لیجئے، خط تو پڑھ دیجئے،“

ہم نے پھر خط پڑھنا شروع کیا۔ آپ کا خطرہ رسمی مکلفات اور غیر متعلق

باتوں سے بالکل پاک ہے، اور جو حالات آپ نے لکھے ہیں وہ میرے لئے

اطمینان بخش ہیں۔ لڑکی کی تصویر بھیج رہا ہوں۔ اور میرے یہاں اس میں

کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے کہ میرے یہاں پردہ کی بھی پابندی نہیں

ہے۔ غالباً آپ بھی اتنے ہی آزاد خیال ہوں گے اور یہی اندازہ کرنے

کے لئے آپ نے تصویر طلب کی ہے۔ اب آپ مجھ کو موقع دیں، اور میں

آپ کو موقع دیتا ہوں۔ کہ اپنے اپنے ذرائع سے ایک دوسرے کے لئے

تحقیقات کر لیں۔ میرا شجرہ نسب منسلک ہے آپ بھی اپنا شجرہ ارسال کر دیں۔

اور نفسی حالات لکھیں۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام

راقم عبدالمجید

بیگم نے خط سن کر بے صبری کے ساتھ کہا: ”اچھا دیکھوں تو تصویر،“

ہم نے کہا: ”تصویر تو دیکھئے گا۔ مگر خط سن آپ نے“

بیگم نے کہا: ”جی ہاں! یہ سنا ہے کہ تحقیقات ہوگی۔“

ہم نے کہا: ”تحقیقات تو جب ہوگی، کہیں خط کا جواب بھی دوں اور اگر

تحقیقات ہوئی بھی تو کیا میں جو لاہ ثابت ہو جاؤں گا۔ یا میرا فی نکلوں گا؟

یہی نا کہ شدہ ہوں، یہی بات ان کو معلوم ہو جائے گی۔“

مریخ کی سیر

بیگم نے کہا: ” اچھا خیر، تصویر تو دکھائیے۔“

ہم نے لفاظی سے تصویر نکالنے سے منع کیا، ” اگر تصویر صحیح ہے تو لڑکی بری نہیں۔“

بیگم نے تصویر دیکھ کر کہا: ” ارے۔۔۔۔۔“

ہم نے کہا: ” کیا ہے؟“

بیگم نے جلدی سے کہا: ” کچھ نہیں یہ تو لڑکی کی تصویر ہے؟“

ہم نے تعجب سے کہا: ” اے سبحان اللہ۔ تو کیا آپ یہ سمجھتی تھیں کہ لڑکی

کے والد کی تصویر ہوگی؟“

بیگم نے کہا: ” نہیں امیر! مطلب یہ ہے کہ یہ تو واقعی ابھی لڑکی سی ہے؟“

ہم نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا: ” لڑکی ہے ہی، لڑکی سی کیا معنی؟“

بیگم نے کہا: ” اچھی ہے۔ واقعی اچھی ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں ہیں تاک

نقشہ بھی اچھا ہے۔ بال بھی لمبے ہیں۔“

ہم نے تصویر پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہا: ” اور چہرے سے ڈہانت بھی

برستی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ پڑھی لکھی لڑکی کی تصویر ہے۔ تصویر کھینچنا بھی

ایک مستقل فن ہے اور اس فن کو یہ لڑکی جانتی ہے۔“

بیگم نے تصویر پر انگلی رکھ کر کہا: ” یہ کیا ہے ہاتھ میں؟“

ہم نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ” غنائی ٹینس کا بلائے ہوئے ہے

پوری تصویر ہوتی، تو سمجھ میں آتا کہ کیا ہے۔“

بیگم نے کہا: ” ہاں ٹھیک کہتے ہیں آپ، یہ ٹینس کے بلے کا دستہ ہی

ہے۔ اچھا تو پھر اب بھینچے اپنے حالات لکھ کر۔“

مریخ کی سیر

ہم نے تصویر کھانے میں رکھتے ہوئے کہا۔ اب میں کیوں لکھوں کچھ مجھے تو
میں یہ بتانا تھا، کہ میں بھی ایسا گیا گذرا، اور ایسا گراڑا تو نہیں ہوں، کہ مجھ کو
کوئی پوچھے ہی نہیں۔“

بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ بری بات ہے وہ بے چارے جو اب کا تظا
کریں گے۔ اور آپ ہیں کہ مذاق کر کے بیٹھ رہے وہ غریب اور بھی سلسلہ جذباتی
نہ کر سیکرگا۔“

ہم نے کہا ”کمال کرتی ہیں آپ بھی، تو کیا میں ان کو یہ لکھ دوں کہ میں نے
مذاق کیا تھا؟“

بیگم نے غور کرتے ہوئے اور خدا جانے کس خیال میں کھوجانے کے
بعد کہا ”ہاں تو آپ کیا لکھنے کا ان کو؟“

ہم نے لاپرواہی سے کہا۔ کچھ بھی نہیں، بس چپ۔“
بیگم پھر کچھ کھوسی گئیں اور چند منٹ تک خاموش رہنے کے بعد بولیں۔
آپ یہ لکھ دیجئے۔ کہ اس عرصہ میں میں نے ایک دوسری جگہ سے خط و کتابت
شروع کر دی ہے۔ تاکہ وہ سچا رہ آپ کے بھروسے پر بیٹھا تو نہ رہے۔“

ہم کو بھی یہ بخوبی مستقل نظر آئی اور یہی طے کرنے کے بعد ہم دفتر کے کمرے میں
چلے آئے۔ مگر واقعہ تو یہ ہے کہ اس وقت دل و دماغ پر یہ تصویر جیسے کچھ چھپانی
سزا جاتی تھی، اس لڑکی کے میز پر شہینے کا طریقہ اور تصویر کھچھاتے ہوئے کمرہ
کی طرف ایک سڑسڑی سی نظر۔ پھر اس کی شاعرانہ نگاہیں اور شاعر کے شکل و
صورت ہلکا سا تبسم اور تبسم میں متانت کی جھلک۔ بالوں کی ڈولیدگی اور

مریخ کی میر

اس انتشار میں بھی ایک غیر مرتب ترتیب ان تمام چیزوں کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا تھا؟ شادی کا خیال نہ بھی سہی لیکن اس خیال کو کیونکر روکا جاسکتا تھا۔ کہ ہماری شادی کیوں ہو چکی ہے۔ بہر حال اس وقت ہم میز کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور تصویر ہمارے سامنے تھی۔ مصو نے تصویر کو کھینچا تھا۔ اور تصویر ہم کو کھینچ رہی تھی۔ شرارت نہایت تیزی کے ساتھ سنجیدگی کے مدارج طے کر رہی تھی۔ اور ہم اس طرح خاموشی کے ساتھ اس کیفیت کو دماغ کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جس طرح ایک تاشائی کسی فلم کو دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ غیر ارادی طور پر ہم نے دستلم اٹھایا۔ کاغذ گھسیٹا، اور اپنے تفصیلی حالات خط کے پیرائے میں لکھنا شروع کر دیئے۔ اس وقت صرف ہی ایک بات سمجھ میں آئی تھی، کہ اگر مزید خط و کتابت کی جائے تو آخر حرج ہی کیا ہے؟

خط لکھا اور بھیج دیا۔ مگر اب شرارت سنجیدگی اختیار کر چکی تھی۔ لہذا بیگم کے تقاضوں کے باوجود ہم براہِ رہی کہتے رہے۔ کہ آج نہیں کل خط لکھ دیں۔ حالانکہ خط لکھنا کیا معنی اب تو لکھے ہوئے خط کے جواب کا ہر وقت انتظار رہتا تھا۔ تصویر اس کثرت سے دکھائی گئی تھی۔ کہ اب حفظ ہو چکی تھی اور بغیر دیکھے ہی ہر وقت اسی کو دیکھا کرتے تھے۔ بیگم نے آج کل کی ٹال مٹول سے عاجز آ کر اپنے سامنے ہم سے خط لکھوایا۔ مگر ہم نے باہر جا کر اس خط کو چاک کر دیا۔ بیگم اس ذکر کو رفتہ رفتہ بھول گئیں۔ مگر یہاں نہایت زور شور کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ اور اب اس حد تک اس

درج کی سیر

شرارت نے سنجیدگی اختیار کر لی تھی۔ کہ عبد الحمید صاحب ہم سے انگوٹھی تک منگا کر لڑکی کو پسنا چکے تھے۔ اور ہم نے بھی اس خیال سے انگوٹھی بھیج دی تھی۔ کہ آخرا اس شرارت کی کچھ قیمت ہونا چاہئے مگر انگوٹھی بھیجنے کے بعد نیا شو کو فریہ یہ کھلا۔ ان صاحبزادی کا نام بھی موصول ہو گیا۔ جو نہایت سادہ اور نہایت معصوم طرزِ نظیر کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ حالانکہ ہمارے لئے یہی بہت بڑی بات تھی کہ ایک غیر شاہی لڑکی اپنے منگیتر کو خط لکھے۔ مگر وہ ایک ایسے آزاد گھرانے کی لڑکی تھی، جہاں غالباً انگوٹھی کی رسم کے بعد خط و کتابت کی اجازت اور آزادی دے دی جاتی ہے۔ بہر حال ہم نے بھی اسی سادگی کے ساتھ خط کا جواب دے دیا۔ یعنی ”جناب من“ کا جواب ہماری طرف سے محض ایک سطر تھا یعنی — ”وہ تسلیم، آپ ہی بتائیے اور ہم کیا لکھتے، مگر اب تو خطوں کی بوجھار شروع ہو گئی۔ ایک دو، تین ہر ہفتہ، ہفتہ میں دو بار۔ ایک دن بیچ کر کے اور پھر روزانہ اخبار کی طرح۔ بغیر اتوار کی تعطیل کے بلکہ اتوار والا سنڈے ایڈیشن کی طرح ذرا فرصت سے لکھا ہوا طویل، حالانکہ ان تمام خطوں میں وہی کالج کی باتیں، استانیوں کے جھگڑے، سہیلیوں کی خرافات کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ مگر ہمارے لئے تو یہ مصیبت تھی، کہ ان خطوں کو چھپائیں کیونکہ ان خطوں کا سلسلہ بند کریں۔ تو کیونکہ ہم عبد الحمید صاحب کے تقاضے کہ فوراً آؤ۔ اور ہم لوگوں سے مل جاؤ۔ زمین سخت اور آسمان دور والا مضمون صادق آ رہا تھا۔ رچھ کو کبیل سمجھ کر اوڑھ لیا تھا۔ اور اب کبیل چھوڑتا تھا۔ خطوں کا جواب

مریخ کی سیر

دینا بند کر دیا۔ مگر آنے والے خطوں کو روکنا ہمارے بس میں نہ تھا ایک مرتبہ سوچا کہ اپنے انتقال کی خبر لکھ بھیجیں۔ پھر ارادہ کیا، کسی سے عبد الحمید صاحب کو یہ لکھو ادیں کہ لڑکا نہایت نالائق اور آوارہ گرد ہے۔ عنقریب گرفتار ہونے والا ہے کبھی ضمیر نے ملامت کی تو تمام سچ حالات لکھ بھیجے گا ارادہ کیا۔ مگر نہ یہ لکھا نہ وہ، اور خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، ہر دو تین خط کے بعد ایک مختصر سا خط ہم لکھ دیتے تھے، اور اس کے جواب میں چھ چھ سات سات صفحات کے متعدد خطوط ادھر سے آجاتے تھے۔ عجیب مصیبت میں جان تھی۔ بیگم بے چاری کو کیا خبر، کہ ان کے سعادت آشنا رشوہر صاحب کیا گل کھلا رہے ہیں۔ مگر اس خیال سے دم ہی نکلا جاتا تھا کہ جب ان کو خبر ہوگی اس وقت کیا ہوگا؟ ایک آدمہ مرتبہ تو یہ بھی ارادہ کیا کہ لاؤ بیگم ہی سے تمام واقعہ کہیں۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ کہ ایک بے وقوف شوہر جب خود داری کی حماقت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو وہ پھانسی تک کو قبول کر سکتا ہے۔ مگر اپنی ذاتی اور نجی بیوی کے سامنے منفعل ہو کر گردن جھکائے کو کبھی تیار نہیں ہو سکتا حالانکہ ہم ایسے بے وقوف نہیں ہیں۔ مگر خدا جانے کیوں یہ حماقت ہم پر بھی سوار تھی اور اسی ازداری میں بات کا بتنگڑ بنتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طوفان تھا، جو ہم کو حباب کی طرح ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا اور عقل حیران تھی کہ آخر اس طوفان سے ہم نکلیں گے کیونکر۔ شادی کرنے کا خیال تک نہ تھا، مگر جو مذاق سنجیدگی اختیار کر لے، اس کو پھر مذاق کیونکر مانتا یا

مرخ کی سیر

جاسکتا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں، کہ وہ بڑا کارساز ہے۔ اور بڑا مسبب لاسنا ایک روز دیکھتے ہیں، کہ پوسٹ میں صاحب نے لا کر دو لفافے دیئے۔ ایک ہمارے نام اور ایک ہمارے ”گھر میں سے“ کے نام ایک ہی قسم کے دونوں لفافے۔ ایک ہی خط میں دونوں لکھے ہوئے ہمارا افاضہ توخیر ہماری منگیتہ کا تھا۔ مگر بیگم کے نام جو خط عقاود بھی یقیناً اس شخص، جگہ، یا چیز کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ جس نے ہمارے نام کے لفافہ پر لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس شک کے بعد پرانے خطوط کو کھولنا مجربانہ طور پر جائز ہو جاتا ہے۔ لہذا ہم نے نہایت احتیاط کے ساتھ پانی لگا کر لفافہ کھولا، اور اب جو اب جو اسے پڑھتے ہیں تو سہ

رات گزری نور کا ترکا ہوا

ہو شیار اسکول کا لڑکا ہوا

ان ہی صاحبزادی کا خط۔ بخدا ان ہی مسماۃ کا دلانا مہ تھا اور ستم یہ کہ

معلوم ہوا کہ عرصہ سے خط و کتابت جاری تھی، ملاحظہ ہو ذرا یہ خط:-

پیاری سیدہ - تمہارے خط کے ساتھ ہی ابا جان کے اور میرے

نام تمہارے شوہر نامہ ار کے خطوط بھی آئے، وہ حضرت اب تک

ابا جان کو مغالطہ میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ میں ابا جان سے کسی کسی

طرح کہتا دیتی، مگر تمہاری اجازت کے بغیر اس سلسلہ کو کیسے ختم

کر سکتی ہوں؟ مگر خدا کے لئے میری تصویر ان حضرت کے قبضہ سے

نکال لو۔ اب کے میرے نام ان کا جو خط آیا ہے۔ وہ بھیج رہی ہوں

اس کا جواب فوراً لکھ کر بھیجو۔ فی الحال تو میں خط کی محض رسید

مریج کی سیر

دے رہی ہوں، اچھا یہ بتاؤ کہ یہ تماشہ ختم کب کرو گی؟ امی جان دعا
کستی ہیں۔

موقاری بہن

رضیہ

اب معلوم ہوا کہ تصویر دیکھ کر سلیم صاحبہ کا بے ساختگی کے ساتھ ”اے“
کہنا کیا معنی رکھتا تھا اور اب پتہ چلا، کہ شرارت محض سنجیدگی ہی نہیں بلکہ حادثہ
بھی ہی سکتی ہے۔ خیر یہ تو سب کچھ ہوا مگر یہ تو بتائیے کہ اب ہم کھریں کیونکر جائیں

؟—

پہنچنے

نانی فطو

نانی فطو کی عمر کا انداز کسی اور کو کیا ہوتا جبکہ خود وہ کچھ اس طرح حساب لگایا کرتی تھیں کہ بس یہ سمجھ لو کہ فذریں بارہ برس کی تھی۔ اور منگنی میری چوکی تھی اللہ بخشے تمھارے نانا کو جو اسی فذریں مارے گئے اس پر ہم لوگ جمع کرتے کہ: نانی جب وہ بے چارے منگنی کے بعد اور نکاح سے پہلے ہی مر گئے تو نانا کیسے ہو گئے وہ ہمارے“

اس پر وہ کچھ غور کرنے کے بعد اپنے پو پلے منہ سے مسکراتے ہوئے کہتیں کہ — اے ہاں سچ تو ہے عقل پہ پتھر پڑیں میری۔ نانا تو تمھارے وہ ہوئے ناجن سے بعد میں میری شادی کر دی گئی۔ وہ بے چارہ میرا ٹھیکرے کا منگیترا تو ناشاد ہی مار دیا گیا تھا۔ ہائے کیا گیر و جان تھا۔ وہ میدے اور شمار سیا رنگ۔ گال جیسے کالہ سیب رکھے ہوں۔ با دام جیسی آنکھیں“

اور ہم میں سے کوئی نہ کوئی چھپرتا نانی کو —، “عشق تھا۔ شاید نانی آپ کو ہمارے نہ ہو سکتے والے نانا سے“

اور وہ اس عمر میں بھی بڑھاتے ہوئے کہتیں — چل دور۔ ہمارے زمانے میں

مرحج کی سیر

یہ عواشق و شوقین ہوتا تھا یہ ہوا تو اسی زمانے میں چلتی نظر آتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مرنے والے کو اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔“

پھر ان سے سوال ہوتا..... اور نانی ہمارے اصل نانا کے متعلق کیا رائے ہے“

وہ بڑی سنجیدگی سے کہتیں..... اے وہ بھی آدمی کا بچہ تھے دوسرے یہ کمرد ذات کی صورت ہی کیا۔ البتہ اگر رنگ پکا نہ ہوتا تو وہ بھی ناک نقشتے کے ہزار دو ہزار میں ایک تھے۔ مگر نوج بیوی ایسا مزاج ہو کسی کا غنہ جیسے ناک پر رکھا رہتا تھا۔ اللہ ان کی روح کو نہ شرمانے۔ زندگی بھر مجھ کو میرے اسی منگیتر کے طعنے دیتے رہے اور خود حال یہ تھا۔ کہ وہی مثل کہ سہ

آج یہ جان ہیں تو کل وہ جان

آپ کی جان سب پہ قربان

نانی بغیر کوئی شعر پڑھے اتنی بات کر گئیں اسی پر تعجب ہے ورنہ وہاں تو بات پچھے ایک پھر لگتا ہوا شعر لے لیجئے ان کے انداز بیان کے تو ہم لوگ ارفقہ تھے۔ چنانچہ ہر دوسرے تیسرے ہی ہوتا۔ کہ رات کو کھاپنی کب سونے سے پہلے سب کے سب نانی کو گھیر کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور وہ سنا سنا شروع کر دیتی تھیں دنیا جہان کے قصے جن میں ان کی زبان کی مٹھاس اور انداز بیان کی شیرینی سب ہی کچھ ہوتی تھی۔ البتہ بقول نجانئی جان کے وہ صرف ضعیف ہی نہ تھیں۔ بلکہ روای ضعیف بھی تھیں۔ اور اکثر تو ایسی بے پرکی اڑتی تھیں کہ اس بات کا یقین ہو جاتا تھا۔ کہ شاید انھیں خدا کو متہ دکھانا ہی نہیں ہے۔ مثلاً ایک

مریج کی سیر

دن کہنے لگیں کہ :-

اللہ بخشے تمہارے نانا جب بنگال کے سفر کو جانے لگے۔ تو میرا نانا تھا ٹھنکا کہ خدا ہی ہے جو وہاں کی جادو گرہوں سے بچ کر یہ آجائیں۔ وہ ٹھہریں آدمی کو مکھی بنا دینے والیاں اور یہ ایسے دل پھینک کہ مکھی بن کر بھی ان ہی پر پھینکتے ہیں ان سے تو میری بوٹی بوٹی کا پستی تھی ان کے غصے سے۔ نتیجہ یہ کہ گئے اور وہاں سے ایک بلا اپنے سر لگا لائے۔ اور ڈھٹائی تو دیکھو اس بنگال کو لا کر چھ سے کہنے لگے۔ کہ اس کو موت نہ سمجھنا سہیلی ہے۔ میں ملاپ سے رہو گی تو عیش کرو گی نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ اے بیٹا اب جو میں نے اس بنگال کے ٹھنکے کیے تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے۔ کہ رات کو پلنگ پر اپنے کمرے میں لیٹی ہے کہ تمہارے نانا نے باہر سے کچی جو کھٹکھٹائی تو اس نے لیٹے ہی لیٹے ہاتھ بڑھا کر سترہ گز کی انگنائی پار کی۔ اور دروازے کی کندھی کھول دی۔ وہ تر بوز لے کر آئے ایک اسے دے دیا اور ایک مجھے، میں نے تو اپنا تر بوز چاقو سے کاٹا۔ لکن میں قتلے بنانے اور کھا لیا۔ اور اس نے چھینکے پر ٹانگ دیا تر بوز۔ دوسرے دن جو میں نے پوچھا کہ اے چھوٹی بیگم کھایا نہیں تر بوز۔ تو بولی کہ کب کا کھا چکی۔ اور میں ہکا بکا کر یہ سوانہ کاٹا گیا نہ اٹکی لگی آخر کھایا کیسے گیا۔ تو اس نے چھینکے سے اتار کر وہ تر بوز چھ کو کاٹ کر دکھا دیا کہ اندر سے گودا صاف ہے۔ دن رات بس یہی جان لیو اتا شے دیکھا کرتی اور اپنی جان کو ڈرتی کہ کسی نہ کسی دن ڈیٹن مجھ کو بھی اسی تر بوز کی طرح کھا پی کر چھٹی کرے گی۔

بیٹا ایک دن جو وہ کوٹھے پر دھوپ میں نہانے گئی تو نہ آج اس کا نہان ختم

مریخ کی سیر

ہوتا ہے۔ نکل میں نے دیے پاؤں اوپر جا کر دروازے کے ایک سوراخ سے جھانک کے جو دیکھا تو میرا دم ہی نکل گیا۔ وہ اپنی تمام انتڑیاں لگن میں رکھ کر صابن سے مل مل کر دھو رہی تھی۔ پھر اس نے زبان جو منہ سے گھسیٹی تو وہ کئی گرکھنچی چلی آئی اور وہ اس شیطان کی آنت کو لگی دھونے۔

میں تو بھاگی وہاں سے سر پر سپر رکھ کر اور تمھارے ناما سے آکر میں نے کہا کہ دستے ہو ذرا اوپر دروازے کے سوراخ سے اپنی رانی کا غسل دیکھ لو، وہ جو گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہ موٹی اپنی دونوں آنکھیں ہتھیلی پر نکالے ان کو صابن سے دھو رہی ہے۔ اور لگن میں وہ پیٹ کی ساری انتڑیاں ڈھیر ہیں۔ اس دن ان کو یقین آیا۔ کس ڈائن کے پتے بندھے ہیں۔ آخر میں نے ملاجی کو بلوا کر غسل جو پڑھوایا تو پہلے تو اس نے بڑا ادھم چایا۔ بڑی اچھلی کو دی مگر آخر ملاجی بھی بڑے پہنچے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ پڑھ کر جو دم کرتے ہیں تو چکر کر گری چاروں شانے چیت اور بس دھواں بن کر اڑ گئی۔ اور میرا یہ حال کہ۔ ع
 ”کاٹو تو لہو نہیں بدن میں“

اب اگر ان کی روایتوں پر کوئی ہمنس دے یا بحث کرنے بیٹھ جاتے تو وہ اپنی اور اس کی جان ایک کر دیں ہزاروں قسمیں کھائیں گی۔ اپنے قبر میں پیر لٹکائے ہونے کا حوالہ دیں گی۔ اور مع جوتیوں کے آنکھوں میں گھس کر ضد کریں گی کہ ان باتوں کو سچ سمجھ لیا جائے۔ اب بتائیے کہ ان حالات میں ان کی کسی روایت پر یقین آئے تو کیسے آئے۔ وہ ہزاروں جھوٹ سچ بنا کر بولا کرتی تھیں۔ لہذا ان کے ہزاروں سچ جھوٹ بن کر رہ جاتے تھے۔ جب وہ غدر کی کہانیاں آپتی

مرنج کی سیر

بیان کرتی تھیں۔ توجی چاہتا تھا کہ وہ یہ حالات سچے سچے سنا دیں مگر یہ اصرار تو اس سے ہو جو یہ تسلیم کرنے کو تیار ہو کہ ہاں مجھ کو جھوٹ بولنا بھی آتا ہے چنانچہ اب یہ تو خدا ہی جا۔ نے یا نانی کہ وہ غدر میں تھیں بھی یا نہیں۔ اور جو کچھ وہ بیان کرتی ہیں وہ ان پر گزری بھی ہے یا نہیں۔ مگر جب یہ ذکر چھڑ جائے تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہی تھیں کہ :-

بیٹا خدا وہ دن کسی کو نہ دکھائے اور جو کچھ ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔
اب خدا سامنے نہ لائے۔ مجھے تو وہ وقت بھولنا نہیں ہے کہ تمہارے تانا
اللہ بخشنے گھبرائے ہوئے گھر میں آئے اور کہنے لگے کہ رو پیے پیے۔ زیور سب ایک
پوٹلی میں باندھ لو اور راتوں رات نکل کھڑی ہو جو دھر خدالے جانے نہیں تو صبح
سبک نہ کسی کی جان کی خیر ہے نہ آبرو کی اے بیٹا چھکے چھوٹ گئے۔ سب کے
یہ سن کر جلد ہی جلدی جو کچھ ہاتھ آیا سمیٹا اور تباہاگ کھڑے ہوئے۔ ہم چار
عورتیں اور تین مرد۔ کل سات تھے۔ دھڑا دھڑا گویاں چل رہی تھیں۔
جیسے چنے بھونے جا رہے ہوں۔ یہ موئے گورے تانگے شراب کے نشے میں دھست
مولی کاجر کی طرح کاٹتے پھر رہے تھے سب کو۔ وہ لٹس ٹچی ہوئی تھی کہ خدا کی
پناہ۔ اس پر طرہ یہ کہ آگ لگے میری اس جوانی کی صورت شکل کی تو تھی ہی بالکل
بنی بنانی میم نہیں نظر پڑے کسی گورے کی مجھ نامراد پر اور ہو گیا موٹو۔

سنو تو موئے کی عیاری کہنے لگا یہ کوئی اصل نسل کی میم ہے جس کو تم لوگ
بھگائے لٹے جا رہے ہو۔ میرے نانا نے کچھ کہا تو سنگین اتار دی اس موئے
نے ان کے سینے میں اددوہ وہیں تڑپ کر بھٹڈے ہو گئے پھر میرے ابا جان

مریخ کی میر

آگے بڑھے اور ہم نوگوں سے کہا کہ بھاگو ہم ادھر بھاگے ادھر اس موئے نے ٹھائیں سے گوئی ان پر بھی داغ دی۔ مگر وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ وہی میرا منگیترا اس سے گتھ گیا۔ اور ہم بھاگم بھاگ بڑے امام باڑے تک پہنچ کر ایک اندھیری کوٹھڑی میں دم سادھ کر کھڑے ہو گئے۔ اے بیٹا ساری رات اسی طرح کھڑے رہے تو یہ دمھڑا لگا ہوا تھا کہ پو پھٹتے ہی پکڑے جائیں گے اور جائیں تو جائیں کہاں۔ ہر من من بھر کا ایک ایک پاؤں ہو رہا تھا۔ کبھی گھر سے نکلے ہوتے تو ایک بات بھی تھی زندگی میں یہ نگوڑا ماری پہلی بھگت پڑ دیکھی تھی نہ یہ پتہ کون سا راستہ کدھر جاتا ہے۔ نہ یہ خبر کہ کس طرف پہنچ جائے۔ آخر ادھی رات گزری ادھر اور ادھر ہم چاروں عورتیں اللہ کا نام لے کر نکل کھڑی ہوئیں درختوں کی آڑ لیتے جھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے جدھر منہ اٹھ گیا چلتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ اس خیال سے بھی خون خشک تھا کہ اگر کسی موئے لیڑے۔ یہ پکڑ لیا تو رپہ سے زور کی جو پوٹلی ہے وہ بھی چھینی جائے گی اور اسی کی وجہ سے جان گونا پڑے گی۔ اللہ بخشے خالہ جان نے ایک سنسان سی جگہ پہنچ کر کہا کہ خدا کے لئے اس پوٹلی کو کہیں زمین کو کھود کر دبا دو اچھے دن آئے تو پھر آکر نکال لے جائیں گے۔ تمہیں تو اس کے ساتھ ہی جانوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اماں جان کو انھوں نے وہ پوٹلی نکال کر خالہ جان کو دے دی اور ہم سب نے ایک ٹوٹی ہوئی قبر کی دو تین اینٹیں سر ہکا روہ پوٹلی اس میں دبا دی۔ اور اس جگہ کو اچھی طرح پہچان کر پھر

مریخ کی سیر

چل کھڑے ہوئے۔ تھک کر چور ہو چکے تھے۔ پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ قدم رکھتے کہیں تھے پڑتے کہیں تھے۔ مگر جان ایسی پیاری تھی کہ چلے ہی جا رہے تھے۔ نہ یہ ہوش تھا کہ مرنے والوں پر دو آنسو ہی بہائیں نہ یہ انتظار کہ جس کڑیل جوان کو اس سوئے گورے سے لڑتا ہوا اچھوڑ آئے تھے شاید وہ آسا ہی ہو۔ یہاں تو ہمیں اپنی ہی پڑی تھی۔

نور کے تڑکے ایک گاؤں کے قریب سے گزر رہے تھے کہ ایک دیہاتی نے کڑک کر پوچھا کہ ”کون ہو تم“ اور ہم سب نے کلمہ شہادت پڑھ لیا کہ لو بھئی آئی ملک الموت کی سواری۔ گرجا اٹھلا کرے اس دیہاتی کا وہ نقاش شریف آدمی۔ یہاں بیٹا سن کر کہنے لگا کہ تمہارا اس طرح مارے مارے پھرنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم میرے گھر چلو جو ردکھی سوکھی میں کھاؤں گا وہی تم بھی کھا لینا اور اگر تم پر کوئی آفت آئی تو میری لاش کو روند کر تم تک پہنچ سکے گی“

نانی جان نے دم لینے کے لئے اپنا پاندان سر کرایا چھالیا کاتیا کو دالایا بنا کر پن کٹی میں کوٹا اور چھچھے سے اس پان کا معجون کھا کر پھر تازہ دم ہو کر بولیں:- میں تو یہ کہتی ہوں بیٹا کہ وہ کوئی فرشتہ تھا یا شاید خواجہ خضر ہی ہوں اپنے گھر لے جا کر اس نے ایک کوٹھری جیسا کمرہ ہم چاروں کو دے دیا۔ اب جو ہم وہاں اطمینان سے بیٹھے تو مرنے والوں کی یاد نے ستایا۔ اماں نے سہاگ کی چوڑیاں توڑیں نانی اماں نے بچی سے سفید ڈوپٹہ نکال کر اوڑھا۔

خانہ جان اپنے کڑیل جوان بیٹے کے لئے سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ کہ ہائے مجھ اندھی کی وہی تو لاٹھی تھی۔ اور میں تھی کہ رو بھی رہی تھی اور چوہ بھی بنی

مریج کی سیر

ہوئی تھی کہ یہ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہوا۔ ہم سب کا یہ رونا پیٹنا سن کر وہ بے چارہ دیہاتی آ گیا۔ دیر تک ہم سب کو سمجھاتا سمجھاتا رہا پھر اس نے زبردستی کر کے ہم کو موٹی موٹی روٹیاں اور چنے کا ساگ کھلا یا اسی سے معلوم ہوا کہ ہم لکھنؤ اور سیتا پور کے بیچوں بیچ ایک گاؤں میں ہیں۔ اور اس نے ہر طرح سے ہم کو تسلی دی۔ کہ یہاں کوئی ڈر کی بات نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ ان گوروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ شہر کی دولت لوٹنا چھوڑ کر اس گاؤں کے غریبوں پر حملہ کریں۔ دوسرے اس گاؤں پر اگر آفت آئی بھی تو جب تک گاؤں کا ایک ایک مرد ختم نہ ہو جائے ہم لوگوں پر آنچ نہ آئے گی۔ اے میاں اس نے اور اس کے یہاں کی عورتوں اور بچوں نے ہم لوگوں کی وہ خدمت کی ہے کہ دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔ مگر بد قسمتی نے اب تک ہمارا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔

ایک رات جب سب پڑے سو رہے تھے اس گاؤں میں بھی گولیاں چلنا شروع ہو گئیں۔ اور پھر وہی بھگدڑ شروع ہو گئی۔ میاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان موٹے گوروں کو کہ یہ سنستے سنستے پھول جیسے بچوں کو سنگینوں سے چھید کر اٹھالیتے تھے۔ گولیاں جھونکتے پھرتے تھے۔ میں نے بچوں کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر چیرتے ان کو دیکھا۔ ہم چاروں کو اس دیہاتی نے ایک کوٹھڑی میں جس میں بھیسوں کا بھوسا بھرا ہوا تھا چھپا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسی بھوسے میں خود س کی بیوی اور بیٹی بھی چھپی ہوئی تھی۔

صبح جب موٹے لیٹرے چلے گئے تو معلوم ہوا کہ اس بے چارے دیہاتی کو بھی درخت سے لٹکا کر پھانسی دے گئے ہیں۔ درختوں سے لاشیں اس طرح

مریخ کی سیر

لٹک رہی تھیں جیسے یہ لاشوں ہی کے درخت ہوں۔

اے میاں اب ہم پھر وہاں سے بھاگے اس لئے کہ ہم نے یہاں بھی سنا تھا کہ ان گوروں کا خیال تھا کہ کوئی میم یہاں بھگا کر لانی گئی ہے۔ اور اس کو ان کاؤں والوں نے چھپا لیا ہے۔ میرا ماتھا فوراً ٹھنکا کہ میرے متعلق کہا جا رہا ہے۔ اور ہونہ ہو یہ وہی مرد اور گورا مجھ کو ڈھونڈتا اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں تک پہنچا ہے جو مجھ کو لکھنے ہی میں لے اڑنا چاہتا تھا۔

میں نے اما جان سے کہا کہ جس طرح بھی ہو یہاں سے نکل بھاگو نہیں تو یہ ہمارے خون کے پیاسے پھر یہاں آئیں گے اور ایسا نہ ہو کہ مجھ کو ڈھونڈ لیں۔ ہم میں سے ایک نے کہا۔ ”تو نانی آپ اپنے اس عاشق گورے کو پہچان تو گئی ہوں گی۔“

نانی نے توری بدل کر کہا۔ ”اے جھاڑو پھرے اس موئے کی صورت پر۔ عاشق ہو وہ اپنے ہوتوں سو توں کا۔ لو بھلا میں کیا پہچانتی اس کو سب ہی گورے ایک ہی صورت کے ہوتے ہیں۔ جیسے سب بندر ایک شکل کے ہوتے ہیں۔ تو بھیا پھر رات ہی کو ہم چاروں بھاگ کھڑے ہوئے۔ رات بھر چلتے تھے اور دن بھر کسی ماٹے میں کسی گھنڈر میں کسی جھاڑی واڑی میں دبے کبے بیٹھے رہتے تھے۔ خدا خدا کر کے تین راتیں چلنے کے بعد برے حالوں گرتے پڑتے۔ سیتا پور پہنچ گئے۔ یہاں نانی اماں کے ایک دور کے رشتہ دار رہتے تھے۔ پوچھتے گھبتے ان کے گھر پہنچے وہ بے چارے ہمارا یہ حال دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ اور ہم کو رلاتے تھے۔ آخر وہی بے چارے ہم کو سمیٹ کر بیٹھ گئے۔“

مریج کی ریر

اماں جان نے سلائی کی مزدوری شروع کر دی۔ نانی اماں بچوں کو قرآن شریف پڑھانے لگیں۔ خالہ جان ایک نواب صاحب کے محل میں مغلائی بن گئیں اور میں نے مڑی پھندے کی کڑھائی کا کام شروع کر دیا۔ نانی اماں کے یہ رشتہ دار جن کو ہم سب مرزا صاحب کہتے تھے۔ آخر ایک دن چل گئے میرے لئے کہیں تو اسی کو اپنی بو بناؤں گا۔ تو بیٹا قسمت میں ہی جوڑا لکھا تھا۔ لہذا شادی ہو گئی۔ ہم میں سے کسی نے پوچھا کہ ”اور نانی وہ خزانہ یعنی آپ کا روپیہ اور زیور جو ٹوٹی قبر میں ڈال دیا تھا؟“

نانی نے کہا۔ تو یہ کرو۔ لاکھ ڈھونڈھا۔ چپہ چپہ چھان مارا مگر کچھ نہ ملا۔ ایک ایک قبر جھانکی۔ تمھارے نانا، ستر بجھے مدتوں ڈھونڈتے رہے۔ مگر کچھ نہ ملا۔“

اب کون نانی سے پوچھے۔ اس قصے میں کتنا سچ ہے اور کتنا حاشیہ۔ ممکن ہے کہ یہ محض حاشیہ ہی حاشیہ ہو۔

ڈاکٹر

ہندوستان میں تعلیم اور ترقی و ترقی دونوں کی ترقیاں کچھ اس طرح ساتھ ساتھ جاری ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ میڈیکل کالجوں سے ہر سال ڈاکٹر زیادہ برآمد ہوتے ہیں یا ہر سال دق کے مریض قبرستانوں میں زیادہ داخل ہوتے ہیں بہر حال بظاہر تو ڈاکٹروں ہی کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دق کے مریض شہرت پسند نہیں ہوتے اور نہ اپنے سائن بورڈ پر اپنا مرض لکھتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں کے سائن بورڈ تو اس کثرت سے نظر آتے ہیں کہ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر اتنے ڈاکٹروں کو مریض کہاں سے ملتے ہوں گے اور اگر اتنے ڈاکٹروں کے تناسب سے اس ملک کے لوگ بیمار بھی ہوتے ہیں تو آخر یہ محکمہ حفظانِ صحت کس مرض کی دوا ہے۔ دراصل ڈاکٹروں کی کثرت سے صرف دو ہی نتیجے نکلتے ہیں۔ اول یہ کہ اس ملک کی سو فی صدی آبادی دائم المریض ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر ڈاکٹر ہی پاس کرنے کے بعد طبابت کے بجائے کوئی دستکاری سیکھنے پر مجبور ہوتے ہوں گے یا پولیس میں بھرتی ہو جاتے ہوں گے یا کسی فلم کمپنی میں نوکری کر لیتے ہوں گے۔ اس لئے

مریج کی سیر

کہ ڈاکٹروں کا تو حال ہے کہ پیسے کی دوا کا کھلا ہوا نرخ ہے۔ کسی گلی کوچے میں چلے جائے۔ وہاں آپ کو ایک آدمہ ڈاکٹر ضرور مل جائے گا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس نہ سہی۔ اہل۔ ایم۔ پی۔ سہی۔ ورنہ ہومیو پیتھک والے ایچ۔ ایم۔ پی تو ضرور ہی مل جائیں گے اور یہ سب گویا ان ڈاکٹروں کے علاوہ ہوں گے۔ جو سرکاری اسپتالوں میں مفت علاج کرنے اور مفت علاج کے ساتھ ساتھ مفت دوا بھی دینے کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ اب بتائیے آفران سب کو ملین کہاں سے ملتے ہوں گے۔ اور ان کی ڈاکٹری کیونکر چلتی ہوگی۔ سرکاری ملازمت محدود ہے اور ڈاکٹروں کی تعداد لامحدود۔ نتیجہ یہ ہے کہ چند تو سرکاری ڈاکٹر ہو جاتے ہیں باقی سب بیوپاری ڈاکٹر بن کر پرائیوٹ پریکٹس کرتے ہیں اور بالکل تجارت کے اصول پر اپنی ڈاکٹری چلاتے ہوں گے۔ ان بیچاروں کی گھریلو زندگی کیا ہوتی ہے۔ اس کو دراصل باہر والے سمجھ ہی نہیں سکتے اور خود سہم کو بھی وہ کجی حالات قیامت تک معلوم نہ ہوتے اگر اس قسم کے ایک پرائیوٹ ڈاکٹر صاحب ہمارے پڑوسی نہ ہوتے۔

ہمارے یہ پڑوسی ڈاکٹر صاحب اچھے خاصے مکان میں اچھی خاصی آن بان کے ساتھ رہتے تھے۔ مطب میں فرنیچر بھی اچھا خاصا تھا اور سوٹ بھی باقاعدہ پہنتے تھے۔ موٹر گاؤں سکندھ بینڈ درجہ سے گزرا کر تھریڈ ہو چکی تھی اور اس کو بیک نظر دیکھ کر وثوق کے ساتھ کہنا دشوار تھا۔ مگر ہم کو معلوم ہے کہ وہ موٹر تھی ضرور اور اگر اس میں پٹرول ڈال دیا جاتا

مریج کی سیر

تھا تو چلتی بھی تھی۔ یہ روایات ہے کہ آواز اور رفتار کے اعتبار سے وہ کسی لاری اور چھکڑے کی سول میرج کی زندہ یادگار نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے سائن بورڈ پر ڈاکٹری کی ڈگری کا حوالہ بھی تھا اور خود ہم نے مزید تصدیق کرنے کے لئے وہ ڈگری بھی ان کے مطب میں آویزاں دیکھ لی تھی۔ جس کے بعد یہ تو گویا طے ہی ہو گیا تھا کہ وہ سند یافتہ ڈاکٹر ہیں اب رہ گیا اس ڈاکٹری کا چلنا اس کو ہم نے ہمیشہ ان کی موٹر کی طرح چلتے دیکھا۔ اول تو آپ کے مطب میں مریض ہی کم نظر آتے تھے اور جو کوئی نامراد ایک مرتبہ نظر بھی آیا تو وہ بڑی مرتبہ اس کو دیکھنے کے لئے آنکھ میں ترس جاتی تھیں۔ اس سلسلہ میں روایات ذرا مختلف ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب کا بیان یہ ہے کہ ایک ہی نسخہ میں چونکہ مریض بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ لہذا وہ لوٹ کر نہیں آتا اور ان کی بیوی اخراجات کے سلسلہ میں مشکلات کا شکار رہتی تھیں۔ بلکہ ان کا خیال یہ تھا۔ کہ چونکہ مریض تمہارا علاج کرتے ہی مر جاتا ہے۔ لہذا اس کو دوسری مرتبہ مطب آنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ان دو بیانات میں ایسا زبردست تضاد ہے کہ ایک غیر متعلق آدمی نہ ڈاکٹر صاحب کی نایب کر سکتا ہے نہ ان کی بیوی کی رائے سے متفق ہو سکتا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب کی ظاہری شان و شوکت دیکھنے والے خواہ ان کو کچھ ہی سمجھتے ہوں مگر ہم تو روزانہ ان کے گھر کے جیگڑے سنا کرتے تھے لہذا ہم جانتے تھے کہ اس خوبصورت غلام میں کس قدر بد صورت تصویر ہے۔ اور اس عظیم الشان ڈھول میں کیسا زبردست پول ہے قصہ دراصل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی بلیہ محترمہ ذرا کھاتے پیتے گھرنے کی تھیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنا

مریخ کی سیر

سب کچھ اپنی تعلیم پر صرف کرنے کے بعد صرف ڈاکٹر بنے تھے اور اب ڈاکٹر ہی کے بجائے اپنی بیوی کے زیورات کے رہین منت تھے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ عورت زیور کو کیا سمجھتی ہے اور کن خیالات کے ماتحت کس طرح زیور کو جدا کر سکتی ہے اور اس امتحان میں کس حد تک ثابت قدم رہ سکتی ہے۔ بہر حال واقعات کچھ ایسے تھے کہ بیوی اپنی جان سے بیزار تھیں اور ڈاکٹر صاحب مکان داد سے شرمندہ تھے جس کا کرایہ اس حد تک چڑھ چکا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس سے منہ چرانا شروع کر دیا تھا۔ گھر میں تو کھلوادیا کہ مریض دیکھنے گئے ہیں۔ راستہ میں ملاقات ہو گئی تو بس ایک گھنٹہ کا وعدہ کر کے ٹال دیا۔ اس ڈر کے مارے مطب میں بیٹھتا چھوڑ چکے تھے اور باہر نکلنے بھی تھے تو ذرا چو کنا اور مالک مکان سے نظر بھی بچائے ہوئے آخر ایک روز جب مکان دار نے کچھ نامناسب طریقہ پر دروازہ پر کچھ غیر طبعی کلمات کہے تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اس دن ہم کو یہ معلوم ہوا کہ ایک ڈاکٹر کی گھریلو اور بیرونی زندگی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ مکان دار کو تو خیر کسی نہ کسی طرح ٹال دیا۔ مگر بیوی نے فیصلہ کن انداز سے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔

”میں پوچھتی ہوں کہ آخر کب تک یہ بہانہ سازیاں ہوں گی اور ایک سی پر کیا ہے۔ ہر کام میں وقت ہو رہی ہے۔ بچوں کے اسکول کی فیس بیمہ کمپنی کی قسط۔ آپ کی کتابوں کی قیمت۔ ہزار کے دام ایک بات ہو تو کئی جائے۔ میں تو ہر وقت کے تقاضوں سے تنگ آگئی ہوں۔ مگر روپیہ کی صورت کبیں

مریج کی سیر

سے نظر نہیں آئی۔

ڈاکٹر صاحب سعادت مندی کے ساتھ ہنسنے رہے اور اس کے بعد تہمت پریشانی کے ساتھ کہا۔

”آخر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ میں ڈاکٹر ہوں ڈاکٹری سند موجود ہے۔ مطلب کرتا ہوں۔ بیض دیکھ لیتا ہوں۔ آپریشن کر سکتا ہوں۔ مگر حال یہ ہے کہ مہینوں کوئی مریض ہی نہیں آتا آخر میں مریضوں کو کہاں سے لاؤں۔ اگر کسی بازار میں مریض ملتے ہوتے تو وہیں سے لے آتا۔“

بیوی نے جل کر کہا: ”تو پھر اس ڈاکٹری کمبخت کو چھوڑو نا۔ آخر کب تک یونہی ایڑیاں رگڑی جائیں گی؟“

ڈاکٹر صاحب نے معصومیت کے ساتھ کہا: ”ڈاکٹر ہو کر ڈاکٹری کو کیسے چھوڑوں۔ آج تک کسی ڈاکٹر نے یہ بھی نہ کیا ہو گا کہ پاس کرے ڈاکٹری و شروع کر دے ٹکٹ کلکٹری یا سب رجسٹر ادا۔“

بیوی نے کہا: ”پھر آخر بات کیا ہے کہ تم کو ڈاکٹری سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی؟“

ڈاکٹر صاحب نے کہا: ”مجھ ہی پر کیا منحصر ہے اس سڑک پر چار ڈاکٹر اور تین ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر رہتے ہیں اور میں تو ان میں سے ہر ایک کے مطلب میں سناٹا ہی دیکھتا ہوں قصہ دراصل یہ ہے کہ بد قسمتی سے اس شہر کی آب و ہوا اچھی ہے اور یہ بھی ہمارا مقدر کہ کوئی دوائی مرض بھی یہاں شروع نہیں ہوتا اور کچھ دنوں کے لئے ذرا ہیضہ شروع ہو گیا تھا۔ اور خود تم اس زمانہ میں بے حد خوش نظر آتی تھیں مگر یہ قسمت کی گردش ہی تو ہے کہ جب سے وہ

مریج کی میر

میضہ گیا۔ آج تک اس شہر میں کسی کو پھینک تک نہیں آئی۔ ورنہ میرے پاس
کوئی مراکھیا آتا۔“

بیوی نے کہا: ”اور جو تم سوداگر صاحب کے لڑکے کا علاج کر رہے تھے۔
ان سے تو کبھی کبھی مل ہی جاتا تھا۔“

بیوی نے کہا: ”اور وہ سیٹھ صاحب کی بو بھی کیا تم نے مار ڈالی۔“
ڈاکٹر نے سراو پنا کر کے کہا: ”نہیں صاحب وہ کجنت تو حیرت انگیز طریقہ پر
اچھی ہو گئی۔ میں نے لاکھ لاکھ اس کو جھولانا چاہا۔ اور مرض کو ایک حالت پر
قائم کر دینے کی ہر تدبیر کی۔ مگر وہ ایسی بے دیا کہ اس کو بروہہ و فائدہ کرنے لگی۔
جس سے کہ نقصان ہونا چاہئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل اچھی ہو کر چلی گئی۔
در اصل یہ تمام باتیں مقدرات سے ہوتی ہیں۔“

بیوی نے کہا: ”تو کیا آج کل کوئی بھی مریض نہیں ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے کہا: ”دو مریض ہیں۔ ایک تو بے چارہ اس قدر غریب
ہے کہ علاج کے علاوہ اس کی کچھ مالی امداد بھی کرنی چاہئے اور دوسرے صاحب
کل ملے ہیں۔ ان سے ذرا امید ہے۔ سنا ہے کہ مالی حالت ابھی ہے۔ اور
آنتوں کے دق میں مبتلا ہیں۔ تمام ڈاکٹروں نے آنتوں کی دق تجویز کر کے
ان کو ڈراٹھا لیا ہے کل تو وہ خود مطب میں آئے تھے مگر میں نے ان سے کہہ دیا
ہے کہ آپ کے لئے نقل و حرکت مضر ہے۔ لہذا امید ہے کہ وہ اب مجھ ہی کو
بلائیں گے۔ اور میں ان کی اس قابلیت سے انشاء اللہ علاج کروں گا کہ۔
بیوی نے بات کاٹ کر کہا: ”کہ وہ جلدی سے اچھے ہو کر چلے جائیں تو یہ

مریخ کی سیر

سلسلہ بھی جائے“

ڈاکٹر صاحب نے ہھلا کر کہا: ”اجی لا حول ولا قوۃ“، پہلی پوری بات تو سن لیا کرو۔ قابلیت سے علاج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنا عقیدہ بنا لوں گا۔ دوستوں سے فائدہ ہوا تو تیسرے میں پھر ان کو اس قابل بنا دوں گا کہ وہ فوراً ٹھجھ کو بلائیں۔ پھر ذرا ان کی حالت میں سکون پیدا کر دیا۔ اگر یہ سلسلہ کچھ دنوں چل گیا تو مکان کا کرایہ پورا انشاء اللہ ادا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مریض کی حالت ابھی ایسی ہے کہ اس کو کچھ دنوں اسی مدوجزر میں رکھا جائے“

بیوی نے کہا: ”میں تو اس کجخت ڈاکٹری کو خدا جانے کیا سمجھتی تھی۔ اور ڈاکٹروں کی آمدنی میرے خیال میں ہمیشہ بہت ہی زیادہ ہوتی تھی۔ مگر میں پوچھتی ہوں کہ آخر یہ جو بہت بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں ان کو آخر مریض کہاں سے مل جاتے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے کہا: ”اوہو۔ یہ تمہارے سمجھنے کی چیز نہیں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ روپیہ روپیہ کو کھینچتا ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ڈاکٹری چل رہی ہے۔ حالانکہ محض موٹر چلتی ہے ڈاکٹری بھی چلنے لگتی ہے اب اگر میں اسی طرح موٹر دوڑاؤں تو جس طرح مکان دار نے جینا دو بھر کر دیا ہے اسی طرح پیڑوں والے ناطقہ بند کر دیں اور موٹر روزانہ کارخانہ میں مرمت کے لئے کھڑی ہوئی نظر آئے۔ یوں جب میں اس پر نکلتا ہوں تو لوگ دو رو یہ کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟“

مریج کی سیر

بیوی کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ باہر سے ڈاکٹر صاحب کو کسی نے آواز دی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے گڑبڑا کر اٹھے ہوئے کہا: ”وہی مریض ہے جس کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا۔ ذرا اس سے کہلو دیجئے کہ ڈاکٹر صاحب مریضوں کو دیکھنے گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔ آپ مطب میں بیٹھیے۔ اتنی دیر میں کپڑے پہن کر پشت کے دروازے سے نکل جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب ادھر کپڑے پہننے لگے اور ادھر ہم نے کپڑے پہننے شروع کئے کہ آج ڈاکٹر صاحب کے مطب کی سیر کریں گے اور ان کی نگہ بلیو حالت دیکھنے کے بعد ان کے مطب کی شان دیکھیں گے۔ چنانچہ جس وقت ہم پہنچے ہیں۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب مطب میں تشریف نہیں لائے تھے اور ہم کو اسی مریض سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ مریضوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ مگر ہمارے پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب اپنا ہینڈ بیگ لئے ہوئے اس طرح تشریف لائے گویا سینکڑوں مریضوں کو دیکھ کر آ رہے ہیں۔ مطب میں آتے ہی آپ نے حیرت سے اس مریض کو دیکھ کر کہا۔ ”آپ غالباً وہ مریض ہیں جن کے متعلق میں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ نقل حرکت نہ کریں؟“

مریض نے کہا: ”جی ہاں میں وہی ہوں۔ مگر میں نے آپ کے حکم کی خلاف ورزی اس لئے کی کہ آج مجھ کو یوں بھی اٹھنا ہی تھا۔ اس لئے کہ ایک مقدمہ کی آج پیشی ہے لہذا میں نے کہا کہ آپ کو بھی دکھا دوں۔“

ڈاکٹر صاحب نے اپنے چہرہ پر خطرہ کی زنجیر لٹکتے ہوئے کہا: ”مگر جناب

مریخ کی سیر

زندگی اور تندرستی سب سے مفق ہے۔ بہر حال یہ میرا مشورہ ہے کہ آپ نقل و حرکت نہ کریں۔ ورنہ جو چیز آج محض ضعفِ معدہ ہے وہی ترقی کر کے آنتوں کو زخمی کر سکتی ہے اور دوسرے ڈاکٹروں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہو سکتا ہے۔“

مریض نے کہا: ”میں آئندہ احتیاط رکھوں گا۔ مگر آج دیکھ لیجئے“

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: ”مجھے دیکھنے میں کوئی عذر نہیں۔“

مگر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا اس لئے کہ نقل و حرکت کے بعد آپ کے تمام نظام میں بیجا بنی کیفیت ہوگی اور اس بیجا بنی کیفیت میں سے کچھ سمجھ نہ سکوں گا۔“

ہم نے ڈاکٹر صاحب کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے کہا۔

”چلنے پھرنے سے تو واقعی ضعفِ معدہ نہایت خطرناک ہو جاتا ہے۔“

اکثر آنتیں الٹ جاتی ہیں۔ اور معدہ کا منہ پھر جاتا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے ہم نکلیں پھاڑ کر کہا: ”جی ہاں میرے پاس ابھی چار دن

پہلے ایک مریض تھا۔ اس نے چلنا پھرنا نہیں چھوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضعف نے

پیٹ کی دق کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب اسے ہلکے پھینش شروع ہو گئی ہے

جس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔ میں ان کے سلسلے میں اسی لئے ڈرتا ہوں

حالانکہ پھر میرے لئے دقت ہو جائے گی کہ وقت نکال کر ان کو دیکھنے جاؤں اس لئے

کہ آج کل تو مریضوں کی کثرت کی وجہ سے وقت ہی نہیں ملتا۔ صبح چھ بجے کا

نکلا ہوا ہوں اور اب پھر جا کر غالباً نو دس بجے چھٹی ملے گی۔ مگر جس طرح بھی

ہو گا ان کو دیکھوں گا۔ مجھ کو تو ان کا علاج کر کے یہ بتانا ہے کہ ذرا سی بات

کو یہ ڈاکٹر محض فیس وصول کرنے کے لئے کس قدر خوفناک ثابت کرتے ہیں۔“

مریخ کی سیر

آپ کو ذرا سخت قسم کا ضعفِ معدہ ہے اس کو دق بخوریز کر دیا ہے۔
مختصر یہ کہ اس مریض کو ڈاکٹر صاحب نے یوں ہی ٹال دیا۔ معلوم نہیں
کہ پھر اس نے ڈاکٹر صاحب کو گھر پر بلایا یا نہیں بہر حال اب ڈاکٹر صاحب
ہمارے پڑوسی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ مکان دار سے آخر نچھ نہ سکی۔ اور ڈاکٹر
صاحب ایک کم کرایہ کے مکان میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ ان کا مکان اب
ایک گلی میں ہے۔ جس کے دروازہ پر سائمن بورڈ مع ڈگری کے ٹک رہا ہے۔
اور وہ ٹوٹا ہوا موٹر کھڑا ہے جس سے محلے کے بچے کھیلتے ہیں۔

خدا جنت نصیب کرے

آدم پر مرے مطلب سے قبل ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک بہت بڑی غلط فہمی کا امکان ختم کر دیا جائے۔ لہذا ناظرین نوٹ کر لیں کہ اس مضمون کی ہیروئن موجودہ شوکت دہن نہیں بلکہ وہ مرحومہ ہیں جو عرصہ ہوا احسان کر گئیں اور اپنے غریب شوہر کی انشا پر دازمی کا داغ لے ہوئے حملہ عروسی سے گوشہ قبر میں منتقل ہو گئیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

خدا جنت نصیب کرے مرحومہ بڑی خوبیوں کی نبی بی تھیں۔ شکل و صورت بھی بس یہ کہنے کہ غنیمت تھی، پڑھی لکھی بھی اتنی تھیں کہ راہ نجات اور گریا میں سے دونوں یاد ہوں نہ یاد ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ پڑھی دونوں تھیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آدمی تھیں کچھ دار اور جانتی تھیں کہ زیادہ لکھنے پڑھنے سے آدمی کی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے اور اس زمانہ میں لکھنا پڑھنا بے کار بھی ہے۔ یہی وجہ تھی ان کو خاص چرٹھ اس بات سے تھی کہ یہ خاکسار دفتر میں دماغ کو چرٹھ بنانے کے بعد اپنے فرصت کے اوقات میں بھی کتاب کا کیڑا بنا رہے یا لکھتا رہے۔ چنانچہ وہ اس کی خاص احتیاط راہ شفقت زوہونی رکھتی تھیں کہ ایسا موقع

مرحج کی سیر

بھی نہ آنے پائے لہذا ہوتا یہ تھا کہ جہاں اس خاکسار نے کوئی کتاب اٹھائی یا قلم ہاتھ میں لیا۔ وہ فوراً اپنے پائینچے سنبھالتی ہوئی تشریف لے آئیں اور ہم نے جیسے ہی کچھ لکھنے کے لئے دماغ میں کوئی پلاٹ تیار کیا۔ انھوں نے فوراً اپنے میکے کے واقعات پڑوسن کے حالات۔ مغلامنی کی داستان عشق وغیرہ شروع کر دی اور ہمارا انشا پردازی کا ارادہ جس وقت تک ملتوی نہ کرادیا سر پر سوار ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ رسائل کے ایڈیٹر صاحبان تقاضے کرنے کے بعد صبر کر چکے تھے۔ انشا پردازی کی تمام انگلیں گھٹ گھٹ کر چکی تھیں۔ قلم کا نب زنگ آلود ہو گیا تھا۔ دوات میں روشنی خشک پڑ گئی تھی۔ کاغذ کا سفید رنگ پڑے پڑے بادامی ہو گیا تھا اور انشا پردازی کا دماغ رفتہ رفتہ مفلوج ہو رہا تھا مگر وہ تو کئے کہ فطرت کو بروقت رحم آگیا اور اس نے ہماری خطرہ میں پڑی ہوئی شوکت تھا نویت کو مرحومہ کے وصل نہیں بلکہ وصال پر ملال سے بال بال بچا لیا ورنہ آج یہ مقالہ سپردِ قلم کرنے کے بجائے ہم کسی گراس فارم میں گھاس کھود رہے ہوتے۔

خدا جنت نصیب کرے مرحومہ نے جب بہت ستایا تو ہم نے بھی چوری شروع

کر دی اور بجائے دن میں لکھنے کے اپنا دستور یہ کر لیا کہ جب رات کو تمام دنیا سوئی تھی، ہم لکھتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ رات کو دس ساڑھے دس بجے وہ سو گئیں اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اب وہ وافی سو گئیں ہیں۔ ہم چپکے سے اٹھے۔ لالٹین کی بتی تیز کی اور لکھنے لگے۔ اگر مقررہ سیدھا ہوا تو لکھ لیا کچھ ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ ہم اپنے خیال کی دنیا میں ہیں۔ قلم چل رہا ہے۔ کاغذ سیاہ ہو رہا ہے صفحہ قرطاس پر انشا پرداز کے دماغ سے الفاظ کی شکل میں ادبی اور علمی نکات و

مریخ کی سیر

دھوز کی بارش ہو رہی ہے۔ آنکھیں کاغذ پر ہیں اور دماغ میں عجیب منظر ہے کہ

”آفتاب کی تیز اور چمکدار شعاعیں بادل میں آکر نم ہو رہی ہیں اور زمین پر

وہ گرم اور روشن شعاعیں نہیں بارش کی ٹھنڈی لطیف درباریک بوندیں

گر رہی ہیں۔۔۔“

یہ ایک انھوں نے لحاف سے منہ نکال کر ہمارے لیے خیر می اور محویت کے حامل ہیں۔

”اے کیا آپ لکھ رہے ہیں۔“

ہم یہ کیا ایک چونک پڑے اور اس جنبش سے کاغذ پر قلم نے ایک بے معنی لکیر

کھینچ دی۔ ہم نے سنبھلے ہوئے کہا:۔

”ہاں ذرا لکھ رہا تھا میں۔“

انھوں نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا بجا ہو گا۔“

ہم نے گھڑی دیکھے ہوئے کہا۔ ”ایک بجے میں کوئی دس منٹ باقی ہیں۔“

انھوں نے محبت سے کہا۔ ”اچھا تو اب سو جائیے رات زیادہ آگئی ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بہت ضروری چیز ہے۔ دفتر کا کام اگر نہ کیا تو گئی نوکری۔“

بیگم صاحبہ نے مجبور لہجہ میں فرمایا:۔

”تو رہے اس نوکری سے آدمی کا ہے کو بھلا زندہ رہ سکتا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”اچھا خیر اب سو جائیے آپ۔“

بیگم نے کہا۔ ”میں تو سو ہی جاؤں گی مگر۔۔۔۔۔“

ہم نے جھنجھلا کر کہا۔ ”لا حول ولا قوۃ آپ نے دماغ سے سب نکال دیا۔“

بیگم نے برامان کر کہا۔ ”واہ۔۔۔ میں کچھ بولی بھی۔“

مرخ کی میر

جگہ ہوتے تو تم بھی میری ہی طرح —

انہوں نے پھر کہا ”آپ سوئے نہیں کیا رات بھر لکھے ہی جائے گا۔“
ہم پھر دھک سے ہو گئے اور پچلتے ہوئے قلم نے یکایک اک کر کاغذ پر روشنی
کا ایک آنسو اس حادثہ کی یاد میں ٹپکا دیا ہم نے کہا:-

بس اب سوئے ہی والا ہوں“

میری ہی طرح مجبور ہوتے اور آج بجائے میرے بھٹار قلم بچھ کو ^{طلب}

کر کے یہ الفاظ —

سیگم نے کہا ”اب ذرا دیر سو بھی رہئے، سر میں درد ہو جائے گا۔

ہم نے کہا ”اس — تغ — فرالٹہ لیجئے میں نہیں لکھتا“

یہ کہہ کر قلم ایک طرف پھینک دیا۔ اور کاغذوں کا پیڑا دوسری طرف اچھال لے
اپنی بوٹیاں اپنے دانتوں سے نوچتے ہوئے لحاف میں گھس گئے۔ ادھر سیگم نے
لو دیاں دینا شروع کر دیں :-

آپ لکھتے ہیں اب زبولوں کی، سر کے درد کا مرض ہے، ذرا اسی شب

بیداری میں درد ہونے لگتا ہے، اسی لئے میں نے کہا تھا میں تو کجخت

ذرا اسی بات زبان سے نکال کر گناہگار ہو جایا کرتی ہوں۔ لاکھ لاکھ

کہا کر لکھنا ہے تو دن ہی میں لکھ لیا کیجئے مگر جب لکھیں گے رات ہی

میں لکھیں گے۔“

ہم نے لحاف کے اندر ہی سے کہا ”غلط کستی ہو جھوٹ بولتی ہو۔ دن کو بھی

بھٹاری وجہ سے نہیں لکھ سکتا جب لکھنے کا ارادہ کیا تم سر پر سوار ہو جایا کرتی

مریخ کا سر

ہو۔ اب میں لکھنا ہی چھوڑ دوں گا تاکہ یہ کوفت نہ ہو۔“

بیگم مسلسل تقریر فرما رہی تھیں۔ ”میری وجہ سے ایسا ہی خلل ہوتا ہے تو

میں کمرے کے باہر دھا کر دوں گی اور اب تو میں نے کان پکڑے کہ کبھی آپ کی

ہمدردی میں بھی کوئی بات نہ کھا کروں گی۔ مہینہ بھر سے برابر چیخ رہی ہوں

کہ حکیم صاحب کے یہاں جا کر سر کے درد کے لئے کوئی نسخہ لے آئے مگر میری سنتا

کون ہے اب سے دو رماموں میں کو بھی سر کے درد نے پریشان کر رکھا تھا۔

انہوں نے حکیم صاحب کا نسخہ کوئی ایک ہفتہ استعمال کیا ہو گا۔ بالکل

اچھے ہو گئے۔ مگر یہاں تو مرض پالا جاتا ہے اور پھر طرہ یہ کہ رات رات بھر

لکھا جائے گا۔ اور صاحب بولتے تو گناہ گار، آنکھوں کا یہ حال ہے کہ روز بروز

چشمہ کا شیشہ موٹا ہوتا جا رہا ہے اور کیوں یہ ہو جب راتوں کو اس طرح

جاگ کر لکھائی اور پڑھائی ہو گی تو آنکھوں کی روشنی کہاں سے رہے گی۔

خدا نے دن کام کے لئے اور رات آرام کے لئے بنائی ہے مگر ان کا کارخانہ

ہی اٹا ہے مجھے۔ کبھی میں نے دن کو رات کر دفر۔

لکھنا۔ پڑھنا۔ تو یہ۔ کان۔ ناک۔ انگلی۔

عینک۔ آنکھ۔ دماغ۔ سوئی۔ مگر۔ اگر۔“

صبح جو ہماری آنکھ کھلی تو دس بجنے میں چھ سات منٹ باقی تھے۔ خیریت یہی

کہ آج تعطیل کا دن تھا۔ درد غیر حاضری گویا بطور کمیشن ہوتی۔ ہم کو بیدار دیکھ کر

بیگم نے چائے لگا دی اور چائے سے فراغت کے بعد بولیں:-

”اب آپ غصہ کو تھوک دیجئے اور پہلے تو حکیم صاحب کے پاس تشریف

مریخ کی سیر

لے جائیے۔ اس کے بعد آکر کھانا دانا کھا کے اطمینان سے رات تک لکھیے۔ جتنا لکھا جائے سمجھو آپ“

ہم نے ایک سعادت مند شوہر کی طرح لفظ بہ لفظ ان کے تمام احکام کی پابندی کی۔ حکیم صاحب کے یہاں بھی گئے اور واپسی پر کھانا بھی کھایا اس کے بعد لکھنے کے لئے بیٹھے بیگم نے حسب وعدہ فوراً کمرہ خالی کر دیا۔ اور ہم کو مضمون نگاری کا پورا پورا موقعہ اس طرح دے دیا کہ اول تو خود مہٹ گئیں، دوسرے خاصداں میں بت سے پان رکھ گئیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ حقہ کا بھی انتظام فرما دیا جس کے کشوں سے دھوئیں کی چادریں اوڑھ کر الماس خانہ فطرت سے دماغ میں خیالات آتے ہیں۔ ہم نے اس رئیسانہ ٹھاٹھ کے ساتھ حقہ کے کش لے لے کر پلاٹ سوچنا شروع کیا۔ اور تھوڑی دیر میں اپنے تخیلات کی دنیا میں گم ہو گئے اور اس عالم محویت میں قلم اٹھا کر کاغذ پر ”۸۶“ لکھنے کے بعد مضمون کا عنوان لکھا۔ ”طوفان“ اس عنوان کے ماتحت ہم جو کچھ لکھنے والے تھے اس کے لئے خیالات کا ایک طوفان ہمارے دماغ میں محدود تخیل تھا۔ لہذا ہم نے لکھنا شروع کیا:۔

”منہم قیامت کی پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور مرتے رہتے ہیں“

”آواز آئی“ ”ذرا ایک منٹ کے لئے رُخِ ظل انداز ہونا چاہتی ہوں۔“

”معلوم ہوا کہ ہم کو تخیلات کی دنیا سے اٹھا کر کسی نے اس بری طرح پھینکا

ہے۔ کہ ہم ابھی اپنے غریب خانہ میں اس کرسی پر آکر گرے ہیں۔ جس پر اس وقت

تشریف فرما ہیں۔ غصہ تو سخت آیا۔ مگر جس بیوی نے خاصداں میں پان رکھے

مریخ کی سیر

حقہ بھردیا۔ جو غریب خود رفیقہ حیات ہونے کے باوجود آج بکمال ایسا رہم کو
مضمون نگاری کے لئے تنہا چھوڑ گئی۔ اس مداخلت بیجا کو انگیز کرنا ہی چاہیے
تھا۔ لہذا ہم نے منافقانہ تبسم کے ساتھ کہا:-

”کہئے کیا بات ہے،“

بیگم نے نسخہ دکھاتے ہوئے کہا ”یہ دوائیں تو بھگوانی جائیں گی“ اور
یہ بیج پیسے جائیں گے۔ ان دو دواؤں کی پوٹلی بنے گی۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں
آتا کہ یہ باقی دوائیں کیا ہوں گی۔ مثلاً یہ خرفہ کے بیج اور یہ آلو بخارے۔
ہم نے نسخہ ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اس کی عبارت کو پہلے پڑھنے اور بعد
میں سمجھنے کی ناکام کوشش کے بعد اس طرح کہا کہ گویا سمجھ گئے“

یہ بیج پیسے جائیں گے۔ یہ شربت بھگوانا جائے گا۔ یہ تمام دوائیں پوٹلی میں
ڈال کر اچھال دمی جائیں گی۔ اور اس عرق سے دو اکاپیالہ دھو کر صبح تازہ
پانی۔۔۔ اس پیالہ میں پلا دیا جائے گا“

بیگم نے غور سے سننے کے بعد کہا۔ سٹے بھی سچ بتائے ہو گا کیا“
ہم نے نسخہ اچھالتے ہوئے کہا ”اسی بدترین حکیم سے پوچھو کہ کیا ہو گا۔
میں کیا جانوں“

بیگم نے مایوس ہو کر کہا ”تو میں ماموں میاں سے پوچھ لوں“

ہم نے کہا ”ہاں ہاں، مجھے بحثو“

بیگم کے جانے کے بعد جو ہم نے اس جملہ پر غور کیا کہ ”منجم قیامت کی پیشین
گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور مرتے رہتے ہیں“ تو یہ جملہ حکیم صاحب کے نسخہ سے

مریخ کی سر

کچھ کم سمجیدہ معرہ ثابت نہ ہو۔ دل چاہا کہ اس جملہ کے آگے حکیم صاحب کا پورا
 نسخہ نقل کر دیں۔ دماغ میں جو خیالات کا طوفان ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھا تھا
 اس کا اب کوسوں پتہ نہ تھا، اور سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ ہم آخر لکھنے والے کیا تھے۔
 تھوڑی دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے یہاں تک کہ سر میں درد شروع ہو گیا اور
 مجبوراً اسی ایک جملہ پر مضمون کو ختم کر کے سر میں رومال باندھ کر کھڑے رہے لیکن مضمون ختم
 مگر خدا بہشت نصیب کرے۔ وہ حال اب کہاں، وہ خلوص وہ ہمدردی،
 وہ سر کے درد کا خیال اب کون کرے موجودہ ہوم گورنمنٹ کا آئین جہاں بانی
 خدا کا نہ ہے۔ اب تو یہ ہوتا ہے کہ مضمون لکھو تو لکھنے کے کمرے میں جا کر لکھو،
 جہاں اگر اتفاق سے قلب کی حرکت بند ہونے لگے تو خلل کے خوف سے شربت
 کا ایک چمچہ بھی حلق میں ٹپکانے کوئی نہ آئے گا۔ اور اس دوران میں کیا مجال
 کہ پرندہ بھی پر مار جائے۔ بچوں کا شور و غل، گھر کی چیل پہل سب یک لخت
 گویا ہڑتال ہو جاتی ہیں اور مضمون زبردستی لکھنا پڑتا ہے خواہ ”شعر گفتن“
 والا مضمون ہو یا ”شعر زادن“ والا مضمون۔ سیکم صاحبہ کو اس سے کوئی بخت
 نہیں ہوتی اور نہ یہ پوچھا جاتا ہے کہ سر میں درد اب کس حد تک ہے۔ مختصر یہ کہ
 وہ رہ کر حرمہ یاد آتی ہیں خدا ان کو پہلو پہلو جنت نصیب کرے۔

وغیرہ وغیرہ

میں ایک مقدمہ میں گواہی دینے لاہور جا رہا ہوں۔ تیز کام مجھ کو نہایت تیزی کے ساتھ کراچی سے دوڑ کر تلی چلی جا رہی ہے مگر ناظرین وغیرہ وغیرہ سے ہیں اس وقت بھی قریب تر ہوں اور اسی فراتے بھرتی تیز کام میں بیٹھا یہ سطرین اس طرح لکھ رہا ہوں کہ ٹریس کی جنبشوں سے قلم صرف اتر سے دکھن ہی کی طرف نہیں چل رہا ہے بلکہ پورب سے کچھم کی طرف بھی چل جاتا ہے اور بعض اوقات تو خط ایسا شکست ہو جاتا ہے کہ اپنے اوپر شبہ ہونے لگتا ہے کہ ”تھانومی“ کے بجائے ”تھانیداز“ ہو گئے ہیں اور ”وغیرہ وغیرہ“ کے بجائے پولیس کارڈ زناچہ لکھ رہے ہیں جس کو پڑھنے کے لئے بھی اسی کو بلایا جاتا ہے جس نے لکھا ہے خیر کچھ بھی ہو مگر وغیرہ وغیرہ کے ناظرین یہ تو گواہی دیں گے کہ یہ تیز کام کی تیز رفتار نامی۔

اور یہ فاصلہ بھی مجھے ان سے دور نہ رکھ سکا اور ع

فاصلہ جتنا بڑھا اتنے قریب آتے گئے

کراچی اور لاہور کے درمیان چلنے والی تمام ٹرینوں میں سب سے زیادہ تیز نام

مریج کی سیر

یہی تیز گام ہے ہر دو اطراف سے اس کی روانگی اور پونچنے کے اوقات اس قدر شریفانہ ہیں کہ ان کا سفر برائے نام رہ جاتا ہے اور سفر کی تمام صعوبتیں راتوں رات خواب و خیال بن کر دبے پاؤں گذر جاتی ہیں۔ کراچی سے تقریباً چار بجے سہ پہر کو ہوا خوری کرانے کے انداز سے مسافروں کو لے کر چلتی ہے اور چند آبادی سے گذرتے ہی ایسا ہتھک تھک کر سلا تتی ہے کہ سندھ کا تمام ریگستان اپنا جلوہ دکھائے بغیر اور اپنی خاک پھنکائے بغیر گذر جاتا ہے اور مسافر جب صبح بیدار ہوتا ہے تو پنجاب کی سرحد شروع ہو چکی ہوتی ہے ناشتہ کرنے ضرورت سے خارج ہونے اور بستر کرنے میں یہ وقت بھی گذر جاتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے کچھ پہلے ہی لاہور پہنچا دیتی ہے۔ اس تکلیف دہ اور طویل سفر کو اس سے زیادہ غیر محسوس شاید کسی اور صورت سے نہیں کیا جاسکتا لاہور سے کراچی جانے کے لئے بھی چونکہ یہی اوقات ہیں لہذا مضمون واحد ہی ہوتا ہے۔

یہ تو ہوئیں تیز گام کی برکتیں اور آسائشیں مگر یہ نیک نام ٹرین ایک معاملہ میں اگر اب تک بدنام نہیں ہوئی ہے تو انشاء اللہ عفتیب سخت بدنام ہو جائیگی اور اس کا پورا نام ہوگا ”تیز گام بے طعام“ خدا اس ٹرین سے سفر کی اپنے ہر نیک بندے کو توفیق عطا فرمائے مگر ان نیک بندوں کے ان اعمال کو بخش دے جن کی پاداش میں اس ٹرین کا کھانا ان کو کھانا پڑتا ہے۔ اس ”عذاب خوردنی“ سے وہ عاقبت اندیش تو بچ جاتے ہیں جو ناشتہ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مگر وہ صاحب بہادر دم کے لوگ نتھنوں چنے چباتے ہیں جو یہ طے کر کے چل پڑتے ہیں کہ

مرخ کی سیر

کھانے کی گاڑی تو ساتھ ہوتی ہے اسی میں بیٹھ کر باقاعدہ چھری کانٹے سے گرم کھانا کھائیں گے اسی قسم کے نا عاقبت اندیشوں میں سے ایک میں بھی تھا اور گھر سے ناشتہ نہ لے جانے کی جو سزا میں نے بھگتی ہے وہ دوسروں کے عبرت پکڑنے کے لئے یہاں پیش کئے دیتا ہوں تاکہ وہ بھی میری طرح پکڑے نہ جائیں۔

اس ٹرین کی کھانے کی گاڑی کا جنس کو انگریزی میں ریسیٹوران کا کہتے ہیں پہلا تجربہ سہ پہر کی چائے کے سلسلہ میں ہوا جب چائے کا پہلا ہی گھونٹ پی کر محسوس یہ ہوا کہ حقے کے پانی میں کالی مرچیں حل کرنے کے بعد درد درد اور شکر ملا دی گئی ہے۔ دوسرا گھونٹ اس کو دور کرنے کے لئے پیا۔ اور تیسرے کی ہمت آخر تک نہ ہو سکی۔ بیرے سے لاکھ پوچھا کہ یہ کس جرطی بوٹی کی چائے ہے اور کن امراض کے لئے مفید ہے مگر وہ اس خاندانی نسخہ کا بھید کھولنے کو تیار نہ ہوا۔ اس لئے کہ اس قسم کے نسخے لوگ اپنے ساتھ قبر میں لے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ آج کی سہ پہر بغیر چائے کے بسر کرنا پڑی۔ سو چاکہ رات کو بڑے ٹھاٹھ سے ریسیٹوران کار میں پہنچ کر ڈٹ کر کھانا کھائیں گے اور چائے کا بھی انتقام اسی کھانے سے لیں گے وہاں پہنچ کر ایک صاحب کو دیکھا جو پہلے نہ جانے بیرے سے کیا سر کھپاتے رہے اور اس کے بعد میجر کو طلب فرما کر نہ جانے کیا کیا کہتے رہے آخر میں نے دیکھا یہی کہ یہ نازک مزاج مسافر بغیر کچھ کھائے پئے میز سے اٹھ گیا۔ مگر میں نے چنداں پروا نہ کی اس لئے کہ ہر قوم میں اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور مجھے دراصل یہ بھی پتہ نہ تھا کہ قصہ کیا ہے آخر ہر صورت

مریخ کی سیر

میں نے عشائری نہیں بلکہ ڈز طلب کیا یعنی ویسی نہیں بلکہ انگریزی کھانا اس لئے
 ویسی کھانا تو گھر پر بھی آخر کھاتے ہی ہیں دوسرے انگریزی کھانے میں ایک
 خوبی یہ ضرور ہوتی ہے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کھا رہے ہیں وہ دراصل
 ہے کیا یعنی رنگ روغن سے اصلیت چھپانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

میرے سامنے سب سے پہلے سوپ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کتھے کے پانی پر
 چونے کی کچھ چھینٹیں پڑی ہوئی ہیں اعتراض اس لئے نہ کیا کہ سیراگنوار نہ
 سمجھے دوسرے صورت سے زیادہ دیکھنے کی چیز سیرت ہوتی ہے مگر اس سوپ
 کا پہلا ہی چھپے پی کے معلوم ہوا کہ یہ دراصل کتھے کا پانی نہ تھا بلکہ جس پانی میں گوشت
 دھویا گیا ہے اسی کو گرم کر لیا گیا ہے۔ بہ مشکل اس گھوٹ کو حلق سے اُتار کر
 سوپ ہٹا دیا۔ اس کے بعد مرغی کے کچھ ٹکڑے کا جبر کے چند قتلوں اور آلو
 کی چند قاشوں کے ساتھ پیراکی کی مشق کرتے ہوئے سامنے آئے۔ قاب
 میں نہایت گندلا شور بہ دیکھ کر سخت وحشت ہوئی۔ مرغی کے ٹکڑے اس قدر
 سخت تھے کہ پھیری جو اب دے گئی۔ دانت بیکا رہا ثابت ہوئے اور جی چاہا

کہ چند اور مسافروں سے پوچھا جائے کہ کیا آپ کے سامنے بھی یہی بوٹیاں
 پیش ہوئی تھیں جو آپ نے شاید اسی لئے واپس کر دی تھیں کہ ان کو پانی
 سے دھو کر ہمارے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ بہر حال ہم نے بھی یہ بوٹیاں
 اپنے پیمانہ گان کے لئے چھوڑ دیں۔ مچھلی آئی تو وہ اس قدر باسی تھی کہ
 یقین ہو گیا کہ یہ طوفانِ نوح کے موقع پر پکڑی گئی تھی اور آج ہمارے
 مددے کو تاریخی اہمیت دینے کے لئے ہمارے سامنے پیش ہوئی ہے۔ پڑنگ

رنج کی سیر
 آٹکھ بند کر کے اس لئے نکل لی کہ بہر حال کچھ نہ کچھ کھانا ہی تھا اور آخر کار
 کافی گوانے لئے کافی سمجھ کر پی کر اٹھ آئے اور وہ فارم بھر دیا جس میں کھانا
 کھانے والے اپنے تاثرات قلم بند کر دیتے ہیں تاکہ ریلوے کے حکام ان
 تاثرات سے اپنے کو کسی نتیجہ پر پہنچائیں۔ بہر حال ہم اپنی سزا کو پوچھ کر
 واپس آگئے۔ اور اب عہد کر چکے ہیں کہ گھر سے ناشتہ لے کر جائیں گے یا
 پیٹ گھر ہی پر چھوڑ جایا کریں گے اس قسم کی ریسٹوران کاروں کا کیا بھروسہ۔

صبح اٹھ کر ایک اسٹیشن پر چائے پی جو بہر چند کہ تھوڑا کلاس تھی مگر جڑی بوٹی
 کی چائے پھر بھی نہ تھی شکر ہے کہ لاہور قریب ہے اور اب گھر پہنچ کر گھر یلو
 کھانا نصیب ہو سکے گا۔

یہ گھڑی نہ چھوٹنا

بچو! یہ نہ کوئی کہانی ہے نہ کسی اور کا قصہ بلکہ یہ خود میرا ہی ایک واقعہ ہے جسے میں نے ان بچوں کو بتانے کے لئے اب تک یاد رکھا ہے جو اب اتنے ہی بڑے ہیں جتنا بڑا میں تھا۔

بچو! بات یہ ہے کہ میں بھی اب سے چالیس یا پچاس سال پہلے بالکل اٹھکے ہی برابر کا ایک لڑکا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم تو ماشا، اللہ نیک بچے ہو۔ بڑوں کا کہنا مانتے ہو اور کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس سے تم کو منع کیا جائے مگر میں یوں دیکھنے میں تو بڑا سعادت مند، نیک اور شریف لڑکا تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ تھا بڑا ہی شرمیلے، میری بہت سی شرادیں تو میرے بزرگوں کو معلوم تھیں مگر بہت سی ایسی شرادیں بھی تھیں جن کو میرے نیک بزرگ نہ سمجھ سکے اور جن کا ان کو پتہ بھی نہ چلا۔ مگر یہ واقعہ جو آج میں تم کو بتا دینا چاہتا ہوں میری ایسی چوری تھی جس نے مجھ کو گرفتار کروا دیا تھا اور ایسی شرمندگی ہوئی تھی مجھے کہ میں اُسے بھول ہی نہیں سکتا۔

بھئی ہوا یہ ہے کہ ایک دن ابا جان نے گھر میں آکر ہم سب ہمیں بھائیوں کو

سرخ کی میر

جمع کیا اور سب کو سمجھایا کہ دیکھو میرے ایک دوست کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا ہے وہ یہاں سے جا رہے ہیں مگر ان کا سامان اسی گھر میں رہے گا۔ یہ سب سامان ایک کمرے میں رکھ دیا جائے گا مگر تم میں سے کوئی نہ تو اس کمرے میں جائے نہ اس سامان کو چھوئے۔ پھر امی جان سے کہا کہ آپ بھی ذرا خیال رکھئے گا اس لئے کہ وہ سامان بڑا قیمتی ہے ایسا نہ ہو کہ بچے کسی چیز کو خراب کر دیں۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ سامان ہمارے گھر پہنچ گیا اور ایک کمرے میں رکھا جانے لگا مگر اس سامان میں عجیب عجیب چیزیں تھیں۔ ایک بڑا خوبصورت سا ریڈیو کی طرح کا گراموفون تھا۔ ایک کرسی تھی جس پر بیٹھ کر آدمی تاج سکتا تھا۔ وہ کرسی خود ہی گھوم جاتی تھی۔ ایک مسہری تھی جس پر سونے سے زیادہ اچلنے میں مزہ آسکتا تھا۔ ایک گھڑی تھی جس میں ایک خوبصورت سی گڑیا لٹک رہی تھی جو خود بخود ناچتی تھی۔ ابا جان نے امی جان سے کہا کہ یہ گڑیا بس ناچتی ہی رہتی ہے اور جب یہ ناچنا بند کر دے تو سمجھ لو کہ گھڑی کی چابی ختم ہو گئی ہے مطلب یہ کہ بہت سی ایسی چیزیں تھیں۔ ایک سے ایک لاجواب۔ موٹر سائیکل ہے تو ایسی کہ آدمی کا جی چاہے کہ بس اچک کر بیٹھ ہی جاؤ۔ صوفے ہیں تو ایسے کہ ان میں چھوٹے چھوٹے پٹے لگے ہوئے۔ جی چاہتا تھا کہ ان ہی میں سے کسی صوفے پر بیٹھ کر باجی سے کہیں کہ بس چلائی ہی رہو اس صوفے کو۔

ابا جان نے یہ سامان کمرے میں رکھ کر ایک مرتبہ پھر ہم سب سے کہنا دیا کہ خیر دار جو کسی نے اس میں کی کوئی چیز چھوئی۔ یعنی ہم کو اتنی اجازت

مریخ کی سر

بھی نہ تھی کہ اس سامان میں جو ٹائپ رائٹر آیا ہے اُس سے کاغذ پر اپنا نام ہی چھاپ کر دیکھ لیں جو گراموفون آیا ہے اس پر ایک ہی ریکارڈ لگا کر سُن لیں جو گھڑی آئی ہے اس کی گڑیا کو ذرا بچا کر دیکھ لیں۔ مگر عجوبہ ہی تھی کرتے تو کیا کرتے دل مسوس کر رہ گئے۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ابا جان سو جایا کرتے تھے اور ہم سب کو بھی کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا تاکہ اگر سونا نہ بھی چاہیں تو بھی سونے کی کوشش کرتے رہیں۔ مگر اس دن میں لیٹا ہوا اُن سی تمام چیزوں کے ارمان میں تڑپتا رہا کہ کاش اس کرسی پر بیٹھ کر ناچ سکتا۔ کاش یہ گراموفون سُن سکتا اور کاش اس گھڑی کی گڑیا کو بچا سکتا لیٹے لیٹے خیال آیا کہ اب تو سب سو ہی گئے ہیں۔ اگر اس کمرے میں چپکے سے چلا جاؤ تو کیا تعجب ہے کہ بہت سے ارمان نکل جائیں۔ چپکے سے اٹھے، جوتیاں ہاتھ میں اٹھائیں۔ پھونک پھونک کر قدم اٹھائے اور دروازہ کھول یہ جا اور وہ جا۔ اب جو پونچے ہیں اس کمرے میں تو سامنے ہی وہ ناچنے والی کرسی تھی اچک کر بیٹھ گئے اور لگے اس کو چکر دینے۔ آہا ہا۔ مزہ ہی تو آگیا۔ کرسی سے جی بھر گیا تو موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا ارادہ کیا مگر خیال آیا کہ اگر یہ چل گھڑی ہوئی یا شیطان کے کان بہرے بچ گیا اُس کا بھڑو وغیرہ تو نہ جانے کیا ہو۔ لہذا یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ ٹائپ رائٹر کے حرفوں پر انگلی جو رکھی تو وہ بولا۔۔۔ ”ٹپ ٹپ ٹپ“ اور وہی انگلی دانتوں میں دبا کر ہٹ گئے پھچے کہ یہ تو سب کو جگا دے گا کم بخت۔ آخر

مریج کی بے

اس گڑیا والی گھڑی کے پاس پہنچے اور اس کو ادھر ادھر سے دیکھ کر اس کی بیلی ہی کیل کو گھمایا تھا کہ وہ کم بخت ”ٹرررر“ کر کے اس زور سے بجاتی ہے کہ ہوش اڑ گئے۔ اب اس سے لاکھ کہتے ہیں کہ خدا کے لئے چپ ہو جا مگر وہ ایک نہیں سنتی ”ٹررر“ جاتی ہے۔ ہاتھ اس کے سامنے جوڑے، کان پکڑ کر اس کے سامنے اٹھا بیٹھی کی۔ کرتے کے دامن میں اس کو چھپانا چاہا۔ چمکارا اُسے، خوشامد اس کی کی مگر وہ نہ ماننا تھی نہ مانی اور عین اس وقت جب بھاگنے کا ارادہ کر رہا تھا دیکھتا کیا ہوں کہ دروازے پر والد صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ کہنے لگے — ”دیکھ لیا تم نے یہ ہوتا ہے کہتا نہ ماننے کا نتیجہ اور چوریاں اسی طرح کھلتی ہیں۔“

اس شرمندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ حلوہ تک چرانے کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ کہیں یہ بھی نہ بول اُٹھے اور اس میں بھی الارم نہ لگا ہو۔

شکوہت کھٹاوی

کے پرفٹ مزاجیہ مضامین کے مجموعے اور ناولیں

مضامین	ناول
Rs 2/8 مکرہیں	Rs. 5/- غزالہ
" 3/- برق تبسم	" 3/- خدا خواستہ
1/8/- شیطان کی ڈاڑھی	" 2/- سسرال
1/8/- گرگٹ	" 3/- کارٹون
" 2/8 نوزن	" 3/8 کتیا
" 4/- بار خاطر	" 3/- سینے
1/8/- موٹھی کاٹے	" 2/- سوتیا چاہ
	" 2/- خام خاں
	" 2/- پرہیس
	" 1/8/- سمد خاتون
	" 2/8/- بکواس
	" 2/8/- دل پھینک

